اترپردیش اردواکادمی
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी

خبرنامہ

ماہنامہ اُترپردیش اُردواکادمی لکھنؤ

جون ۲۰۲۴ء

اردو آئی اے ایس اسٹڈی سنٹر میں داخلے کی تیاری کے لئے اسٹیئرنگ کمیٹی کی میٹنگ میں بائیں سے دوسرے نمبر پر
سکریٹری اردو اکادمی ایس ایم عادل حسن اور ڈائرکٹر شفقت کمال (سبکدوش آئی اے ایس) کے ساتھ دیگر رفقائے کار

اردو آئی اے ایس اسٹڈی سنٹر میں جاری لکچر سے فیض یاب ہوتے ہوئے طلبائے اسٹڈی سنٹر

اردو آئی اے ایس اسٹڈی سنٹر کی جدید لائبریری میں استفادہ کرتے ہوئے طلبا وطالبات

اتر پردیش اردو اکادمی

خبرنامہ

جلد : ۵۲ جون ۲۰۲۴ء شمارہ : ۱۲

ایڈیٹر : ایس۔مناظر عادل حسن (سکریٹری)

معاون : محمد معاذ اختر احسن (سپرنٹنڈنٹ)

زرسالانہ : پچاس روپے -/50

قیمت فی شمارہ : پانچ روپے -/5

upurduakademi3@gmail.com

www.upurduakademi.in

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ

سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ،

گومتی نگر، لکھنؤ-226010

فون نمبر:0522-4022924

ایس۔مناظر عادل حسن، سکریٹری، ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر نے امپریشن پرنٹ ہاؤس، لاٹوش روڈ، لکھنؤ سے چھپوا کر دفتر اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ	ایڈیٹر	۲
علی گڑھ تحریک میں رسالہ تہذیب الاخلاق کی خدمات	محمودہ خاتون	۳
غزل	مجاہد سید	۷
غزل	احمد کمال حشمی	۷
ندوۃ العلماء: وقت کی آواز	محمد وصی اللہ حسینی	۸
غزل	شفق طاہری	۱۵
غزل	تشنہ اعظمی	۱۵
ہمہ جہت قلم کار: عبدالعلی فاروقی	ڈاکٹر مخمور کاکوروی	۱۶
فروغ اردو میں کمپیوٹر وانٹرنیٹ کی اہمیت وافادیت	ارم نعیم	۱۹
غزل	سعدیہ صدف	۲۵
شاخ میں اٹکی پتنگ (افسانہ)	ایم اے کنول جعفری	۲۶

●●●

اداریہ

زبان انسان کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتی ہے اور ساتھ ہی تہذیب وتمدن کی امین بھی ہوتی ہے۔اس سچائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہی زبانیں زندہ وتابندہ رہتی ہیں جنہیں سماج ومعاشرے میں زیادہ افراد بولتے ہیں، پڑھتے ہیں اور استعمال کرتے ہیں۔اردو زبان کو ہی یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ اپنی شیرینی، لب ولہجہ کی چاشنی اور مختلف زبانوں کے ثقافتی مزاج کی آمیزش کی وجہ سے مقبول رہی ہے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے بعد بعض متعصب ذہنیت کے لوگوں نے یہ پرچار کرنا شروع کر دیا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، جس کا یہ اثر ہوا کہ یہ زبان آہستہ آہستہ تعصب کی شکار ہونے لگی۔ جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو زبان ہندوستان میں پیدا ہوئی، پلی بڑھی اور یہیں پروان چڑھی۔ ہر ایک کے دل ودماغ پر اس طرح چھا گئی کہ اس کی جڑوں کو کمزور کرنے والی ذہنیت کے لوگ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ اردو بڑی میٹھی زبان ہے، اور اردو کے شعر بھی اپنے مقصد کی خاطر استعمال کرنے لگے اور آج بھی اردو زبان کے اشعار کا اپنی تحریر وتقریر میں برمحل استعمال کر رہے ہیں۔ یہ بھی سچائی ہے کہ اردو زبان باہمی اتصال، تہذیبی وثقافتی ہم آہنگی کی علامت ہے اور دوسروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں اس زبان نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اپنا مخصوص کردار ادا کرنے والی اس زبان نے ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ دیا اور اسی زبان کے اخبارات ورسائل کی نظموں اور ترانوں نے مجاہدین آزادی کے ولولوں اور جذبات کو جلا بخشی اور ہمارا ملک انگریزی حکومت کی غلامی سے آزاد ہوا۔

اردو زبان وادب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ اس زبان کی آبیاری اور ترقی میں مختلف مذاہب کے قلمکاروں نے اپنا خون جگر صرف کیا۔ ایسے شعرا وادبا کی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ روٹی روزی سے وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے آہستہ آہستہ اس زبان سے بے اعتنائی برتی جانے لگی، ان حالات کے باوجود اردو زبان زندہ ہے۔ کمپیوٹر اور سوشل میڈیا کے اس دور میں اردو کی طرف عوام کا رجحان بڑھا ہے۔ انٹرنیٹ پر مہیا بعض ایپ کے ذریعہ نوجوان اردو سیکھ رہے ہیں۔ نئی نسل کے قلم کار بھی سوشل میڈیا کے توسط سے اپنی تخلیقات عوام کے لیے مہیا کرا رہے ہیں۔

اترپردیش اردو اکادمی نے اردو سکھانے کے لیے اکادمی میں ہی انتظام کیا ہے جہاں نئی نسل کے نوجوان اردو سیکھ سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اکادمی اردو کی ترقی وترویج کے لیے مختلف اسکیمیں اور پروگرام بھی چلا رہی ہے جس سے اردو طالب علموں کے علاوہ شعرا وادبا اور ناقدین ومحققین مستفید ہو رہے۔ ''اردو بولیں اردو پڑھیں اور اردو سیکھیں'' اس نعرہ کو محبان اردو عملی جامہ پہنائیں تاکہ اردو زندہ رہے اور دن دونی رات چوگنی ترقیوں سے ہمکنار ہو سکے۔

ایس۔ مناظر عادل حسن

محمودہ خاتون

ریسرچ اسکالر، رام منوہر لوہیا اودھ یونیورسٹی، ایودھیا

علی گڑھ تحریک میں تہذیب الاخلاق کی خدمات

علی گڑھ تحریک کی ابتداء ۱۸۶۸ء میں ہو چکی تھی، ۱۸۷۰ء میں سرسید احمد خاں لندن سے ہندوستان واپس آئے اور اسی سال رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا، اگلے سال ۱۸۷۱ء میں انجمن خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کا قیام عمل میں آیا۔ انھوں نے ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم قائم کیا جو ترقی پا کر کالج کی سطح تک پہنچا۔ انھوں نے علی گڑھ میں ایسے دانشور، عالم، فنکار، صاحب قلم تخلیق کار اور عظیم المرتبت شخصیتوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر جمع کر دیا جو نہ صرف سائنسی علوم کے فروغ میں معاون ثابت ہوئے بلکہ زبان و ادب کے فروغ وارتقاء میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان میں ہر مذہب وملت اور رنگ ونسل کے افراد شامل تھے۔ بقول پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی:

> ''عالمی سطح پر سرسید احمد خاں سیکولر تعلیمی (Secular Education Mission) کے بانی تھے۔ انھوں نے اپنے تعلیمی افکار، مذہبی نظریات کو کبھی فرقوں اور ملکوں میں تقسیم نہیں کیا، وہ ہمیشہ مذہبی اور لسانی سطح پر یکسانیت اور مساوات کے علمبردار رہے۔ انھوں نے اپنی علمی بصیرت اور دانشوری کو تعلیم

اواخر دسمبر ۱۸۷۰ء میں جاری شدہ تہذیب الاخلاق کا انگریزی نام (Mohammadan Social Refarmar) رکھا گیا۔ اس رسالہ کے اجراء کے پسِ پشت بنیادی مقصد یہ تھا کہ قوم میں جدید زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے نیز ان تمام خرابیوں کا سدِ باب کیا جائے جو ہمارے معاشرے کو گھٹن کی طرح کھا رہی ہیں۔ بقول محمد علی صدیقی صاحب:۔

> ''اس رسالہ میں شائع ہونے والے ۴۵۸ مضامین میں سے ۲۰۸ خود سرسید احمد خاں کے لکھے ہوئے ہیں۔ سرسید احمد خاں کے مضامین کے عنوانات ہی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی قوم کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی زوال کا سد باب علم سے کرنا چاہتے تھے۔ یہ رسالہ ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو جاری ہوا اور ستمبر ۱۸۷۰ء میں بند ہوگیا۔ یہ رسالہ ۲۳ر اپریل ۱۸۷۹ء کو دوسری بار منظر عام پر آیا اور جولائی ۱۸۸۱ء تک جاری رہا۔ یہ رسالہ ۱۷ر اپریل ۱۸۹۴ء کو تیسری بار شائع ہوا اور ۲ر فروری ۱۸۹۷ء تک جاری رہا۔''

سرسید نے اولین شمارہ میں اس رسالہ کا تعارف ان

''اس پرچے کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سولائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تا کہ جس حقارت سے سولائزڈ (Civillized) یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ مہذب قوم کہہ دیں۔ ۲ ''

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ سید صاحب قوم کی فلاح و بہبود چاہتے تھے نیز ہندوستانی مسلمانوں کو تعلیم یافتہ اور مہذب (Civillized) بنانا چاہتے تھے، ساتھ ہی ان کے علمی شعور اور عقلیت کو زیادہ سے زیادہ روشن دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے سے مذہبی عقائد کی درستی، تو ہمات سے کنارہ کشی، اخلاقی عزت اور غیرت تعلیم نسواں، تعلیم اطفال، ہنر وفن کا ہونا، رفاہِ عام کے لئے کام کرنا، ضبط اوقات، صدق مقال، طرز گفتگو میں شائستگی، نئے علوم کو قبول کرنا، اجتہاد اور تدبر، تدبیر منزل، قومی اور تعلیمی اصلاح، ترقی زراعت، اخلاقی اصلاح، اور جدید تعلیم کی ضرورت وغیرہ کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ واضح رہے کہ سرسید احمد خاں نے اس پرچے میں ایک ہی نوعیت کی تحریریں رقم نہیں کیں بلکہ مختلف موضوعات سے متعلق جن کا ہر حال میں گہرا تعلق مسلمانوں کی تعمیری و تدبیری اور ترقیاتی منازل سے تھا اور سائنسی علوم سے متعلق تحریریں بھی شامل تھیں۔ معاشرتی و مذہبی عنوانات کے مضامین بھی تھے اور ادبی تمثیلی تحریریں بھی ان میں شامل تھیں۔ سیاسی وقومی حالات سے متعلق بھی تہذیب الاخلاق میں تحریریں موجود تھیں نیز تعلیمی و تعمیری مضامین بھی، علاوہ ازیں تاریخی و تحقیقی مضامین بھی تہذیب الاخلاق میں شامل تھے۔

تہذیب الاخلاق کے مضامین کا بڑا حصہ مذہبی علمی اور فلسفیانہ موضوعات پر مشتمل ہے تاہم مذہبی موضوعات کی حیثیت ثانوی ہے لیکن اکثر مضامین میں مذہب کو جدید زندگی کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش ملتی ہے۔ ان میں ایسے مذہبی مسائل زیر بحث آئے ہیں جن کا تعلق عام زندگی سے براہ راست ہوتا ہے، اس کے متعلق انھوں نے لکھا ہے کہ مذہبی معاملات سے پہلو بچانا ہندوستانیوں کے لئے ممکن نہیں:

''اصل مقصد تو ہمارے اس پرچے کا تہذیب قومی ہے۔ مسائل مذہبی کی بحث بہ مجبوری آجاتی ہے۔ ۳ ''

اس اخبار کے مدیر اور منیجر خود سرسید احمد خاں تھے۔ چونکہ یہ پرچہ تجارتی بنیادوں پر نہیں نکالا گیا تھا بلکہ قوم کی فلاح و بہبود اس کا مطمح نظر تھا اس لئے اس پرچے سے جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ اس کی ترقی پر خرچ کی جاتی تھی۔ اس پرچہ کو چلانے کے لئے سرسید نے دوستوں کی ایک کمیٹی قائم کی تھی جس کے ہر ممبر سے ساٹھ روپے سالانہ اور عام خریداروں سے ساڑھے چار روپیہ چندہ لیا جاتا تھا۔ اس رسالہ کا وقفۂ اشاعت متعین نہیں تھا بلکہ اس کے پہلے صفحہ پر مندرجہ ذیل اشتہار دیا جاتا تھا:۔

''یہ پرچہ ہر مہینہ میں ایک بار، یا دو بار یا تین بار جیسا کہ مقتضائے مضامین ہوگا چھپا کرے گا''۔

تہذیب الاخلاق کا دوسرا دور ۱۸۷۹ء سے ۱۸۸۱ء تک جاری رہا۔ اس دور میں شائع شدہ مضامین زیادہ وقیع

نہیں ہیں۔ آخری دور میں ۱۸۹۷ء۔۱۸۹۴ء میں ڈپٹی نذیر احمد کی پر زور تحریک اور نواب محسن الملک کے بھرپور تعاون کے باوجود پہلے دور کا سا جوش وخروش نہیں ملتا، بالآخر یہ رسالہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ضم ہوگیا۔

یہ ذولسانی اخبار تھا۔ اس میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مواد شائع ہوتا تھا۔ یہ اخبار عمدہ کاغذ پر اور ٹائپ میں چھپتا تھا۔ بقول ڈاکٹر سہیل انجم: ''کچھ کالم ایسے جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہوتے تھے اور کچھ مختلف ہوتے تھے۔ اس اخبار کے توسط سے ہندوستانیوں اور انگریزوں میں دوستانہ ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ سرسید چاہتے تھے کہ حکومت اور عوام میں مفاہمانہ روابط پیدا ہوں۔ اس لئے وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں پیش کرتے تھے۔ حالی کے بقول اگر ان کا قیاس غلط نہیں ہے تو اس وقت تک ہندوستان میں کوئی ایسا اخبار نہیں نکلا تھا جس سے یہ دونوں مقاصد پورے ہوتے ہوں۔''[۴]

سرسید صحافت کو صرف خبرنگاری تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے، وہ اس سے بڑے اور ارفع کام لینا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں مسلم معاشرہ میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں اُن کی اصلاح و درستی اُن کے پیش نظر تھی، وہ اخبار کے توسط سے مسلمانوں کے اندر تہذیبی ارتقاء چاہتے تھے تاکہ مغربی اقوام انھیں حقارت کی نظر سے دیکھنا بند کریں، ان کی منشاء تھی کہ مسلمان جسمانی طور پر نہ صرف صاف ستھرے رہیں بلکہ روحانی تطہیر کا نمونہ بنیں، وہ چاہتے تھے کہ مسلمان جدید علوم حاصل کریں اور اُن کے جو بھی مسائل ہیں اُن پر جذباتی انداز میں سوچنے کے بجائے عقل وشعور سے کام لے کر ان کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ انھوں نے مدعا نویسی کو اہمیت دی اور اپنے قارئین کو نہایت سیدھے سادے لب ولہجہ میں مخاطب کیا۔

بقول سہیل انجم صاحب:

''انھوں نے پہلے تو اخبار سائنٹفک سے یہ کام لیا۔ یہ اخبار پہلے ہفت روزہ تھا، جو بعد میں ہفتے میں دوبار شائع ہونے لگا۔

اس میں سماجی، اخلاقی علمی اور سیاسی ہر قسم کے مضامین شائع ہوتے تھے، شروع میں اس کا ادار یہ سرسید خود لکھا کرتے تھے، ان کے بنارس تبادلے کے بعد اس اخبار کی ذمہ داری راجہ جے کشن داس کے دوش پر آگئی تھی۔ جون ۱۸۷۷ء میں جب سرسید سبکدوش ہوکر بنارس سے علی گڑھ آگئے تو انھوں نے اخبار میں کچھ تبدیلیاں کیں اور اسے ظاہری اعتبار سے بھی پُرکشش بنانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں انھوں نے محراب، ٹیڑھے میڑھے حروف اور پھول پتی وغیرہ کو حذف کردیا اور پھر اس کی پیشانی پر انگریزی اور فارسی میں صرف علی گڑھ گزٹ لکھا جانے لگا۔ انھوں نے اخبار میں پتھر کی جگہ پر ٹائپ کو پروان چڑھایا۔ ان کا خیال تھا کہ دیگر زبانیں ٹائپ میں اخبار نکالتی ہیں، اگر اردو اخبار پتھر پر ہی نکلتے رہے تو دوسری زبانوں کی صحافت سے اردو صحافت بچھڑی ہی رہے گی۔ لہٰذا اس

کے باوجود کہ لوگوں کی نظروں میں ٹائپ جچ نہیں رہا تھا، انھوں نے اسے برقرار رکھا۔‘‘ ۵؎

سرسید نے باضابطہ طور پر اداریہ نویسی کو رائج کیا۔ سرسید سے پہلے اداریے لکھے جاتے تھے لیکن اس کی پابندی نہیں کی جاتی تھی۔ کبھی لکھ دیا گیا اور کبھی نہیں لکھا گیا۔ لیکن سرسید نے اسے باقاعدہ ایک فن کے طور پر متعارف کرایا۔ گزٹ میں خبروں کا حصہ زیادہ ہوتا تھا اور انگریزی اخباروں سے بہت سی چیزیں مستعار لی جاتی تھیں۔ اس کے اداریے زیادہ تر تعلیمی امور پر ہوتے تھے۔ انھوں نے ان اداریوں کے توسط سے ایک صحت منداور روشن خیال معاشرے کے قیام کی کوشش کی لیکن حسب موقع برطانوی حکومت پر انگشت نمائی بھی کرتے تھے۔ سرسید نے جو کام اخبار سائنٹفک سوسائٹی سے لینے کی کوشش کی تھی اس کو انھوں نے رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے آگے بڑھایا۔ تہذیب الاخلاق اخبار کے ساتھ ہی ساتھ ایک ادبی جریدہ بھی تھا، اس اخبار میں فرسودہ مضامین کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ انھوں نے اس کے توسط سے ہندوستانی مسلمانوں کی دنیوی واخروی کامیابی کو یقینی بنانے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے مسلمانوں کی خامیوں کو دور کرنے کی طرف بھی توجہ کی۔ اس میں سماجی، سیاسی تعلیمی، تہذیبی، مذہبی اور اصلاحی مضامین شائع ہوتے تھے۔ شروع شروع میں سرسید نے اسے مذہبی مباحث سے دور رکھا لیکن بعد میں مذہبی امور اور فقہ وغیرہ کے مسائل بھی زیر بحث لائے گئے۔ ڈاکٹر سہیل انجم نے

ٹھیک ہی لکھا ہے کہ:

’’سرسید کی صحافت کو اردو صحافت میں ایک اہم موڑ کے طور پر دیکھا جاتا ہے، انھوں نے اپنے اخبارات ورسائل کے ذریعے صحافت کو نئے شب و روز سے ہمکنار کیا، انھوں نے نئے موضوعات دیے اور اردو اخباروں کی نثر پر نئے اسلوب کا رنگ روغن چڑھایا، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ انھوں نے صحافت کی مانند پڑتی چمک دمک کو اپنی تعمیری تحریروں سے جو کہ مقصدیت سے پُر ہوتی تھیں، ایک نیا رنگ عطا کیا، انھوں نے اسے فکر کے نئے سرچشموں سے متعارف کرایا۔ اردو صحافت کے تئیں اُن کی خدمات کو رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔‘‘ ۶؎

❑❑❑

۱؎ سرسید کے سیکولر تعلیمی مشن کی عالمگیریت اور نفاذ۔ مشمولہ سرسید اور فکر سرسید۔ مرتب محمد لطیف میر ص ۴۳

۲؎ سرسید احمد خان اور جدت پسندی، از ڈاکٹر محمد علی صدیقی سن اشاعت ۲۰۰۳ء ص ۷۹

۳؎ مضمون سرسید احمد خاں تہذیب الاخلاق کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر فلک فیروز، مشمولہ ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جولائی ۲۰۱۶ء ص ۷۱

۴؎ سرسید کی صحافت پر ایک نظر مشمولہ ماہنامہ ایوانِ اردو، دہلی، بابت مارچ ۲۰۱۸ء ص ۱۱۵

۵؎ سرسید کی صحافت پر ایک نظر مشمولہ ماہنامہ ایوان اردو دہلی، بابت مارچ ۲۰۱۸ء ص ۱۱۵

۶؎ سرسید کی صحافت پر ایک نظر مشمولہ ماہنامہ ایوان اردو دہلی، بابت مارچ ۲۰۱۸ء ص ۱۱۶۔۱۱۵

مجاہد سید
مہدی گنج، لکھنؤ-Mob.8601471591

غزل

بھٹکنے والے جو دریا کے خواب دیکھتے ہیں
تھکے ہوئے یہ مسافر سراب دیکھتے ہیں

نفس کی آمد و شد میں عذاب دیکھتے ہیں
جو زندگی کا مکمل نصاب دیکھتے ہیں

لہو لہان ہیں صحرا میں تشنہ کام مگر
ہر ایک زخم میں اپنے گلاب دیکھتے ہیں

ہر ایک عضو میں پاتے ہیں اپنی حرف و صدا
جو اپنے جسم کی پیہم کتاب دیکھتے ہیں

سراب بن کے بلاتے نہیں وہ صحرا میں
جو اپنے آپ کو تصویر آب دیکھتے ہیں

جنہیں یہ زعم ہے یک چہرگی ہے ان کی صفت
ہم ان کے چہروں پہ دایم نقاب دیکھتے ہیں

اسی لئے تو وہ جاتے ہیں جانبِ صحرا
نشاط و لطف جو خانہ خراب دیکھتے ہیں

احمد کمال حشمی
کانکی نارہ، مغربی بنگال-Mob.9433145485

غزل

ہاں، بہار آئی مگر جشن بہاراں نہ ہوا
چاک دامن نہ ہوا، چاک گریباں نہ ہوا

قیس نے بھی مری وحشت کو سلامی دی ہے
کون ہے وہ جو مجھے دیکھ کے حیراں نہ ہوا

مندمل ہوگئے سب زخم مرے، صد افسوس
دل مرا دل ہی رہا کوئی گلستاں نہ ہوا

پھر پرستش تری کرنے نہیں دے گی دنیا
بس یہی سوچ کے اب تک میں مسلماں نہ ہوا

میں تو جزدان میں رہتا ہوں صحیفے کی طرح
پوسٹر بن کے میں دیوار پہ چسپاں نہ ہوا

میں نے بس عشق کیا، عرض تمنا کب کی
میں نے بس شعر کہے، داد کا خواہاں نہ ہوا

آہ ! کیسا تو مرض پال کے بیٹھا ہے کمالؔ
چارہ گر سے بھی ترے درد کا درماں نہ ہوا

محمد وصی اللہ حسینی
حسین گنج، لکھنؤ-Mob.9307282929

ندوۃ العلماء : وقت کی آواز

عالمی شہرت یافتہ ادارہ ندوۃ العلماء نے علمی، فکری، تعلیمی، تصنیفی، ادبی اور صحافتی میدان میں جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں وہ روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ فرزندان ندوہ کے کارناموں کا اعتراف عالمی سطح پر کیا گیا ہے۔ یہ ممتاز ادارہ اپنے قیام سے لے کر آج تک ملک وملت کی رہنمائی کا فریضہ بخوبی انجام دیتا آرہا ہے۔ ندوہ کی اہمیت وضرورت کو سمجھنے کے لئے اس کے تاریخی پس منظر پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اس لئے ہم یہاں ندوہ اور اس کے فضلاء کی خدمات پر روشنی ڈالنے سے قبل قیام ندوہ کے وقت کے حالات کو قدرے تفصیل سے پیش کررہے ہیں تاکہ اس ادارے کی معنویت اور اس کی قدر وقیمت کا تعین کرنے میں آسانی ہو۔

ندوۃ العلماء کے تاریخی پس منظر پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ اس ادارے کا قیام وقت کا عین تقاضا تھا۔ جس وقت تحریک ندوۃ العلماء شروع ہوئی اس وقت مسلمانوں کی حالت ایک زخمی شیر کی طرح تھی۔ صدیوں سے حکمرانی کرتی چلی آرہی قوم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ انقلاب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے شکست نے مسلمانوں کو مزید مایوس کردیا تھا۔ انگریزوں نے ایسی پالیسی وضع کی کہ مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں پچھڑتے چلے گئے، سیاسی سماجی اور تعلیمی اعتبار سے ان کی کوئی وقعت نہیں رہ گئی۔ دینی سطح پر بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچایا گیا۔ عیسائی مشنریوں کا جال پورے ملک میں پھیلتا چلا گیا۔ خارجی سطح پر متعدد مبارزات کا سامنا کررہی ملت بیضا داخلی سطح پر بھی کئی سنگین مسائل سے دوچار تھی۔ ظاہری طور پر قدیم وجدید کے دو حلقوں میں منقسم قوم اندرونی طور پر مسلک ومشرب کے نام پر متعدد خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ عربی مدارس میں صدیوں پرانا نظام تعلیم رائج ہونے کی وجہ سے زمانہ شناس علماء کی پیداوار کم ہوتی جارہی تھی۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں مسلمانوں کی درماندگی و مایوسی، انتشار وافتراق سے فکرمند اور جامد نصاب تعلیم سے بیزار علماء کا ایک طبقہ اس وقت کے روشن ضمیر عالم دین مولانا محمد علی مونگیری کی قیادت میں اٹھ کھڑا ہوا اور تحریک ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی۔ اس انقلابی وفکری تحریک نے ابتدا میں اصلاح نصاب تعلیم اور رفع نزاع باہمی کو اپنا نصب العین بنایا۔ پھر

آہستہ آہستہ مقاصد میں اضافہ ہوتا گیا اور کامیابی بھی ملتی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے پژمردہ دل ودماغ کے لئے ندوۃ العلماء ایک خوشگوار جھونکا ثابت ہوا۔ اس ادارے کو وقت کی آواز کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

قیام ندوۃ العلماء کے وقت یعنی انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں مسلمان موٹے طور پر دو متوازی طبقوں میں منقسم تھے۔ پہلا طبقہ علمائے دین کا تھا جو عربی مدارس کا پروردہ تھا۔ دوسرا مغربی تعلیم یافتہ طبقہ تھا جو عصری درسگاہوں کا فیض یافتہ تھا۔ دونوں کے راستے اور انداز فکر جداگانہ تھے اس زمانے کے عربی مدارس میں قدیم طرز تعلیم درس نظامی رائج تھا۔ ان کی اپنی خصوصیات اور امتیازات تھے۔ اس کے باوجود مدارس کے طلباء کے قیمتی اوقات کا بڑا حصہ معقولات پر بلاضرورت صرف ہو رہا تھا۔ دینیات بالخصوص قرآن، حدیث اور فقہ پر توجہ بہت کم تھی۔ اس طرز تعلیم کے مدارس میں دارالعلوم دیوبند کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے باوجود خود دارالعلوم کے حلقوں میں رائج نصاب تعلیم کے تئیں بیزاری پائی جانے لگی تھی۔

دوسرا طبقہ جدید مکتب خیال کے افراد پر مشتمل تھا، جس کی قیادت سرسید احمد خاں کے ہاتھوں میں تھی۔ سرسید کا خیال تھا کہ تعلیم وتربیت، تہذیب وتمدن، معاشرت واخلاق اور افکار ونظریات میں مغرب کی تقلید کرو اور اس کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھال دو۔ وہ جدید علوم کو اس کے عیوب ونقائص کے ساتھ بغیر کسی تنقید وترمیم کے اختیار کرنے کے داعی تھے۔ علوم میں سرسید کا سارا زور انگریزی زبان وادب کے حصول پر تھا۔ اس کے باوجود سرسید مرحوم دینی تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے تھے اور علما کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن جدید تعلیم یافتہ حضرات میں سے ایک طبقے نے علماء کو ضدی، تاریک خیال اور دقیانوسی کی شکل میں ہمیشہ پیش کیا جب کہ علماء کے پیش نظر اختلافی مسئلہ انگریزی تعلیم کے حصول کا نہیں تھا بلکہ سوال ایمان وعقیدہ کی حفاظت اور تہذیب وثقافت اور معاشرت میں مغربیت سے احتیاط کا تھا۔ علماء کے اس موقف کا اعتراف اس طبقے نے بھی کیا ہے جو سرسید کی تحریک سے وابستہ رہا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''سرسید جس طرح یا جس حد تک مغربیت سے متاثر تھے اس سے نہ حالی کو اتفاق تھا نہ شبلی کو نہ نذیر احمد کو، یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں مولوی تھے۔ لیکن پچاس سال بعد معلوم یہی ہوا کہ جہاں تک مغربیت سے احتیاط برتنے کا سوال تھا، سرسید اور سید امیر علی دونوں سے یہ (مولوی) طبقہ زیادہ صاحب نظر نکلا۔''

مولانا شبلی نعمانی جو عرصے تک علی گڑھ کالج کے اسٹاف میں اور سرسید کے رفیق کار کی حیثیت سے خدمت کرتے رہے، لکھتے ہیں:

> ''انگریزی خواں نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی برائے نام نہیں، بس خالی کوٹ پتلونوں کی نمائش گاہ ہے۔''

لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ

سرسید تحریک سے مسلمانوں کو جو فائدہ پہنچا ہے ملت اسلامیہ اس کے بار احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ سرسید نے جس خلاء کو پر کیا ہے اگر وہ پر نہ کیا گیا ہوتا تو آج مسلمان ذلت و پسماندگی کے کس مقام پر ہوتے اس کا تصور کر کے کلیجہ منھ کو آجاتا ہے۔

اگر دونوں تحریکیں اپنے اپنے مقاصد کے تحت کام کرتے ہوئے ایک دوسرے سے ربط و تعاون کا معاملہ رکھتیں تو ملت اسلامیہ کے لئے بڑی مفید ثابت ہوسکتی تھیں۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ اپنے وقت کی یہ دونوں بڑی تحریکیں نہ صرف ایک دوسرے کی مخالف تھیں بلکہ ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے میں بڑی توانائی صرف کر رہی تھیں۔ دونوں تحریکوں کی بنیاد دو انتہا پسند نظریات اور رجحانات پر قائم تھی۔ علی گڑھ تحریک مغرب کے رنگ میں رنگ جانے کی داعی تھی تو تحریک دیوبند ہر اس چیز سے گریزاں جو مغرب سے منسوب ہو۔

اس نازک، پر انتشار اور بحرانی دور میں ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا۔ 1892ء میں وقت کے ایک روشن ضمیر اور صاحب دل و دماغ عالم دین مولانا سید محمد علی مونگیری کی تحریک پر مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر انجمن ندوہ کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ پھر 22، 23، اور 24 اپریل 1894ء کو اسی مدرسہ فیض عام کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر کانپور میں ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا۔ منتخب اہل نظر اور دردسر جوڑ کر ایک جگہ بیٹھے اور انہوں نے اس کا ایک حل تجویز کیا یہ پہلا موقع تھا کہ جب اہل نظر اہل دل کے ساتھ، علمائے دین جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ساتھ، مسلک حنفی کے علمبردار علمائے اہل حدیث کے ساتھ، زاہد و گوشہ نشین بزرگ امراء رؤسا اور ماہرین تعلیم کے ساتھ شانہ بشانہ اور صف بہ صف نظر آئے۔

مولانا محمد علی مونگیری کو ندوۃ العلماء کے نام سے قائم مجلس کا پہلا ناظم اور سکریٹری مقرر کیا گیا۔ اس اجلاس میں جو جید علماء موجود تھے ان کے نام یہ ہیں۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا حافظ شاہ محمد حسین الٰہ آبادی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا خلیل احمد مدرس دوئم دیوبند، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا نذر محمد پنجابی، مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا سید محمد علی مونگیری، شیخ الہند مولانا محمود الحسن مدرس اول دارالعلوم دیوبند، مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی، مولانا ظہور الاسلام فتح پوری، مولانا عبدالغنی خاں، مولانا فخر الحسن گنگوہی اور مولانا سید شاہ تجمل حسین دسنوی۔ پہلا اجلاس کانپور میں ہوا۔ دوسرا اجلاس 12، 13، 14، اپریل 1895ء کو لکھنؤ کے قیصر باغ کی بارہ دری میں منعقد ہوا۔ اس کے بعد ملک کے گوشے گوشے میں ندوۃ العلماء کے اجلاس ہونے لگے اور اس تحریک کا خیر مقدم کیا جانے لگا۔ 12 محرم الحرام 1313ھ کو شہر بریلی کے جلسے میں مولانا محمد علی مونگیری نے سب سے پہلے دارالعلوم کے قیام کا خاکہ پیش کیا، جسے دوسرے سال کے جلسۂ عام میں بحث و مباحثہ کے بعد منظور کر لیا گیا۔ اس مجوزہ دارالعلوم کے قیام کے لئے متفقہ طور پر لکھنؤ کا انتخاب ہوا جو ہر طرح اس علمی ادبی اور تہذیبی مرکز کے شایان شان تھا۔ کانپور سے علماء کا ایک وفد مولانا مونگیری

کی قیادت میں 10 / مارچ 1898ء عیسوی کو لکھنؤ روانہ ہوا۔اس وفد میں مولانا مسیح الزماں خاں ،مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانی، مولانا حاجی محمد یونس خاں ،مولانا خلیل الرحمان سہارنپوری ،مولانا ظہورالاسلام فتح پوری اور مولانا حفیظ اللہ وغیرہ تھے۔منشی احترام علی کاکوروی،اور منشی احتشام علی کاکوروی نے کشادہ دلی سے دریائے گومتی کے کنارے اپنی ایک وسیع قطعہ آراضی ندوۃ العلماء کے حوالے کی۔یہ جگہ اس وقت برورہ حسن باڑی کے نام سے مشہور تھی۔

2 ستمبر 1898 کو کانپور سے ندوہ کا دفتر منتقل ہوکر لکھنؤ گولہ گنج آ گیا۔26 ستمبر 1898ء کو دارالعلوم کا عملی افتتاح گولہ گنج کی خاتون منزل میں ہوگیا،جو دارالعلوم کے لئے منشی احتشام علی کاکوروی نے ۹ہزار روپے میں خرید کردی تھی۔پھر رفتہ رفتہ گومتی کے کنارے دارالعلوم کی عمارتیں تعمیر ہونے لگیں اور دارالعلوم خاتون منزل سے دریائے گومتی کے کنارے منتقل ہوگیا۔

ندوۃ العلماء کے بانیوں نے اپنے خواب کی تعبیر کے لئے ایسا دارالعلوم قائم کیا جس کے فارغ التحصیل اعتدال پسند ہوں،جن کا ایک شانہ علمائے دین سے ملا ہوتو دوسرا شانہ عصری درسگاہوں کے متخرجین سے۔ جو مسلکی اختلاف کو زحمت نہیں رحمت سمجھتے ہوں۔ندوہ کے صاحب بصیرت بانیوں نے' اس حقیقت کا ادراک کرلیا تھا کہ نہ مغرب سے بیزاری اسلام کا مطالبہ ہے نہ مشرق کی ہر چیز کو گلے لگانا ایمان کا تقاضا ہے۔قدیم صالح اور جدید نافع کا حسین امتزاج ندوۃ العلماء کی دعوت تھی جس کی پذیرائی اور اس میں مضمر حقائق ومفادات کا ادراک بروقت کیا جاتا تو عالم اسلام کو آج کا روز بد نہ دیکھنا پڑتا'۔

رفتار زمانہ کے ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی ترقی کرنے لگا اور اس کے بانیوں کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے لگا۔ اپنے بنیادی مقاصد رفع نزاع باہمی اور اصلاح نصاب تعلیم میں زبردست کامیابی حاصل کی۔فرسودہ نظام تعلیم ترک کرکے نیا نظام تعلیم وضع کیا اور نصاب تعلیم کو شرعی مطالبات اور عصری تقاضوں کے مطابق مرتب کیا،جس کے ثمرات بھی دنیا کو نظر آنے لگے۔اس ادارے نے مختلف مسالک کے پیروکاروں اور قدیم وجدید طبقوں کے درمیان پل کا کام انجام دیا۔جو ایک دوسرے سے دست وگریباں تھے وہ باہم شیروشکر ہوگئے، مسلمانوں میں اختلافات کی آنچ مدھم ہوگئی۔مسلمانوں کے مختلف گروپوں اور جماعتوں میں جو چپقلش اور چشمک تھی اس میں بہت کمی ہوگئی۔قدیم وجدید حلقوں میں جو بعد اوران کے درمیان خلیج تھی وہ کم ہوگئی۔اصحاب ندوہ اپنے مقاصد کی تکمیل میں آگے بڑھتے رہے اور کبھی پیچھے مڑکر نہیں دیکھا۔دارالعلوم ندوۃ العلماء نے جس عزم وارادے سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا وہ اس نے جاری رکھا۔ملک کے طول وعرض میں ندوۃ العلماء کے جلسے بڑے اہتمام سے منعقد کئے جاتے رہے۔دوسری طرف تعلیم وتربیت ،دعوت وتبلیغ ،تصنیف وتالیف اور صحافت کے میدان میں بھی اس ممتاز عالمی ادارے نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔اس ادارے نے ایسے لعل وگہر پیدا کئے جن سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پورا عالم منور ہوا۔علامہ

سید سلیمان ندوی ، مولانا مسعود عالم ندوی ، مولانا عبدالسلام ندوی ، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی ، مولانا نجیب اشرف ندوی اور مولانا رئیس احمد جعفری ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور ابواللیث اصلاحی ندوی وغیرہ کی خدمات کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو روشنی دکھانے کے مصداق ہوگا ۔ مذکورہ فرزندان ندوہ کی قدیم وجدید دونوں حلقوں میں خوب پزیرائی ہوئی اور ان حضرات پر ہر طبقے نے اعتماد کیا۔ ندوۃ العلماء نے ایسا نصاب تعلیم مرتب کیا اور اپنے طلبا کی ایسے نہج پر تربیت کی کہ ندویوں کو اعتدال وتوازن اور قدیم وجدید کا جامع تصور کیا جاتا ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مختلف مسالک کے ماننے والے اساتذہ وطلبا درس وتدریس سے وابستہ ہیں، لیکن ان کے درمیان مسلکی تنازعہ تو دور کبھی معمولی تکرار کی بات بھی نہیں سنی گئی۔ یہ بات کسی معجزے سے کم نہیں۔ یقیناً یہ بانیان ندوہ اور بعد کے ذمہ داروں کی صحیح تعلیم وتربیت، اخلاص وللہیت اور ان کی فکرمندی ودل سوزی کا ثمرہ ہے۔

تصنیف وتالیف اور صحافت کے میدان میں بھی ندویوں نے اہم خدمات انجام دی ہیں اور اپنی صلاحیت وقابلیت ، فنکارانہ مہارت ، دوراندیشی وبالغ نظری ، ملک وملت کی فکرمندی وغمخواری اور حالات حاضرہ سے گہری واقفیت کا ثبوت دیا ہے اور یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مشرق سے مغرب تک پوری دنیا نے ان کے تبحر علمی کا لوہا مانا ہے اور ان کی زمانہ شناسی کا اعتراف کیا ہے۔ جو چیز دوسرے مصنفین اور قلمکاروں سے فرزندان ندوہ کو ممتاز بناتی ہے وہ یہ کہ انہوں نے نئے اسلوب اور عصری زبان میں لکھا اور ان موضوعات کا انتخاب کیا جن پر کام نہیں ہوا تھا لیکن کام کرنا انتہائی ضروری تھا۔ یہاں کے فضلاء نے ویسے تو تمام موضوعات پر قلم اٹھایا ہے لیکن تفسیر، حدیث ، فقہ، سیرت ، سوانح ، تاریخ ، تقابل ادیان، تاریخ دعوت وعزیمت، عربی واُردو زبان وادب اور ان کی تاریخ، صحافت اور حالات حاضرہ پر ان کا کام سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شہرۂ آفاق تصنیف 'ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین' نے پوری دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا اور علمی وتاریخی افق کو وسیع کیا۔ ان کی دوسری کتاب 'تاریخ دعوت وعزیمت' کے طلائی سلسلے سے نہ صرف اسلامی کتب خانے میں اضافہ ہوا بلکہ اس اہم کتاب نے بہت سے مفروضوں کو بھی غلط ثابت کیا۔ ندوہ کے گل سرسبد علامہ سلیمان ندوی کی رہنمائی میں ندوی فرزندوں نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی اور تصنیف وتحقیق کے وہ جوہر دکھائے کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ انہوں نے اس علمی وتحقیقی ادارے کے ذریعے مسلمانوں کی علمی وفکری، تاریخی وتہذیبی ثقافتی وتمدنی رہنمائی کی اور ان کی ذہنی ودینی تربیت کا فریضہ انجام دیا۔ سیرۃ النبی، سیرت عائشہ، امام مالک، عربوں کی جہازرانی، عمر خیام، حیات شبلی، نقوش سلیمانی، عرب وہند کے تعلقات، خطبات مدراس ، رحمت عالم ، ارض القرآن، المامون، الغزالی، شعرالعجم، شعرالہند، موازنۂ انیس ودبیر، حکمائے اسلام، سیرۃ النعمان، الفاروق، علم کلام، سیرۃ الصحابہ

والصحابیات، تابعین وتبع تابعین کے علاوہ خلفائے راشدین، خلفا بنوامیہ، خلفا بنی عباس کی تاریخ ، دولت عثمانیہ کی تاریخ، حکومت صقلیہ کی تاریخ، تاریخ ہند، اسلام اور مستشرقین مرتب کر کے دارالمصنفین نے اسلامی کتب خانے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

تصنیف وتالیف اور دعوت وارشاد کے علاوہ صحافت کے میدان میں بھی ندوۃ العلماء کی خدمات ناقابل فراموش ہیں ابتدائی دور میں اردو میں 'الندوہ' اور عربی میں 'الضیاء' نے علمی، فکری، ادبی اور تحقیقی مضامین شائع کر کے نہ صرف قلیل مدت میں شہرت کی بلندیاں چھولیں بلکہ کتنوں کو ممتاز مصنف، ادیب اور قلم کار بنادیا۔ اس ادارے نے عربی زبان میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مولانا محمد الحسنی نے 1955ء میں عربی ماہنامہ 'البعث الاسلامی' نکال کر انقلابی اسلامی صحافت کی بنیاد رکھی۔ البعث الاسلامی نے اپنے طاقتور اداریوں، بے لاگ تبصروں اور بے باک مضامین کے ذریعے عالم عرب کے سب سے بڑے فتنے 'عرب قومیت' کو رسوا کر دیا۔ عربی پندرہ روزہ 'الرائد' نے بھی عربوں کے دماغ سے اس فتنے کے مسموم اثرات کو زائل کرنے اور اسلام پر ان کا از سر نو اعتماد بحال کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اردو پندرہ روزہ 'تعمیر حیات' بھی اپنے فکری ودعوتی مضامین کے ذریعے ملت اسلامیہ کی رہنمائی کا فریضہ بخوبی انجام دے رہا ہے۔ ہندی ماہنامہ 'سچا راہی' اپنے اصلاحی ودعوتی مشمولات سے ہندی داں طبقے کو اسلامی غذا فراہم کر رہا ہے اور برادران وطن کی غلط فہمیوں کو دور کرنے نیز ان کو مسلمانوں سے قریب لانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ انگریزی ماہنامہ 'فریگرینس آف اسلام' جدید تعلیم یافتہ طبقے کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرا رہا ہے۔ اردو سہ ماہی 'کاروان ادب' اگرچہ رابطہ ادب اسلامی کا ترجمان ہے لیکن اس عالمی ادبی تنظیم کے ذمہ داران اور رسالے کے مدیر و منتظمین ندوی فرزند ہی ہیں۔ یہ رسالہ اسلامی وتعمیری ادب کا ترجمان ہے۔ صالح افکار ونظریات اور نافع ادبی رجحانات کو فروغ دینے میں نمایاں خدمات انجام دے رہا ہے۔ البتہ ندوہ میں قائم 'شعبہ صحافت' نہ تو اس عالمی ادارے کے شایان شان ہے اور نہ ہی عصری تقاضوں سے ہم آہنگ۔ بتایا جاتا ہے کہ اس بیمار شعبے کا بارِ گراں ایک بیمار صحافی کے دوشِ ناتواں پر ہے۔ حالانکہ بین الاقوامی حالات کو دیکھتے ہوئے آج شعبے کی اہمیت پہلے سے کافی بڑھ گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ ملی درد رکھنے والے پیشے ور صحافیوں اور تجربہ کار افراد کی خدمات حاصل کی جائیں نیز جدید ترین وسائل وذرائع اور ٹیکنالوجی سے اس شعبے کو آراستہ کیا جائے، تاکہ فرزندان ندوہ اس جدید ہتھیار سے مسلح ہو کر دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے ملک وملت کی خدمات انجام دے سکیں اور روزگار سے بھی وابستہ ہو سکیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ روایتی جنگ کا نہیں، فکری جنگ کا دور ہے۔

ندوۃ العلماء کے فضلاء آج بھی تمام شعبوں میں اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی صلاحیتوں کا اعتراف عالمی سطح پر کیا جا رہا ہے۔ عالم اسلام کا نوبیل انعام کہا جانے والا 'فیصل ایوارڈ' ہندوستان میں صرف تین لوگوں کو ملا ہے، جن

میں دو ندوی فرزند ہیں۔ پہلی بار جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، دوسری بار مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور تیسری بار مولانا علی احمد ندوی کو ملا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا علی احمد ندوی کو یہ باوقار ایوارڈ فقہ کے میدان میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں دیا گیا۔ جب کہ ایک حلقے کی جانب سے برابر یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا ہے کہ ندوہ میں صرف عربی ادب کی تعلیم ہوتی ہے۔حدیث وفقہ پر توجہ کم دی جاتی ہے۔

فرزندان ندوہ نے ملک وملت کی قیادت ورہنمائی کا فریضہ بھی بخوبی انجام دیا۔تحریک آزادی ہند میں علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر ندوی فضلاء کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔انہوں نے اپنی تنظیمی لیاقت، علمی خدمات اور فکری قیادت کے ذریعہ نہ صرف بانیان ندوہ کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا بلکہ عوامی توقعات کو بھی پورا کیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے باوقار معتبر اور نمائندہ تنظیم آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کی برسوں صدارت کرتے ہوئے ملت اسلامیہ ہندیہ کی علمی فکری اور دینی رہنمائی کی۔انہوں نے اس سے آگے بڑھ کر عالم اسلام کو بھی اپنی ’فکر بلند‘ سے مستفیض کیا۔مولانا نے بعض انتہائی حساس معاملات میں عربوں کو ان کا اصل مقام بتایا اور جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عرب حکمرانوں کو صراط مستقیم دکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا ان کی علمی لیاقت، فکری قیادت اور اخلاص کی معترف ہے۔مولانا کے بعض امتیازات ایسے ہیں کہ ہندوستان میں وہ کسی کو حاصل نہیں۔ مولانا اپنے ملک میں واحد شخص ہیں جن کو کلید کعبہ پیش کی گئی۔ عالمی رابطہ ادب اسلامی کے پہلے صدر منتخب کئے گئے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامی مطالعات کا شعبہ قائم ہوا تو پوری دنیا کی نظر انتخاب مولانا علی میاں پر آکر ٹھہری اور مولانا نے اس کی مسند صدارت کو رونق بخشی۔ان کے جانشین عربی کے ممتاز ادیب ونقاد ،صاحب بصیرت عالم دین اور ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مسلم پرسنل لابورڈ کی سربراہی کرتے ہوئے امت کی رہنمائی کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا۔مولانا رابع حسنی ندوی خاموش طبیعت کے مالک اور سنجیدہ مزاج کے حامل تھے ،لیکن فکر بڑی بلند تھی۔دوراندیشی ،بصیرت اور معاملہ فہمی ان کو ورثے میں ملی۔ اس کے علاوہ عربی زبان وادب پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کا شمار عربی کے ممتاز ادیبوں اور نقادوں میں کیا جاتا ہے۔ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی اور مولانا سید محمد واضح رشید ندوی بالترتیب عربی ماہنامہ ’البعث الاسلامی‘ اور عربی پندرہ روزہ ’الرائذ‘ کے ایڈیٹر ہیں۔ عالم عرب میں ان کے بے باک اداریوں اور فکری مضامین کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے۔ ان دونوں حضرات کا شمار عربی کے بڑے صحافیوں اور اصحاب قلم میں ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر فرزندان ندوہ نے بھی مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دئے اور دے رہے ہیں۔

❑❑❑

شفق طاہری
میران پور کٹرہ، شاہجہانپور

غزل

بسمل کو ترے یاد دعا ہی نہیں آئی
پھر دل کے دھڑکنے کی صدا ہی نہیں آئی

خوشبو ترے دامن کی اڑا لائی تھی اک دن
پھر ایسی گئی بادِ صبا ہی نہیں آئی

مرنے کے لئے جان لٹانے کی تمنا
جینے کی ابھی تک یہ ادا ہی نہیں آئی

تم کون ہو انساں ہو کہ چوراہے کے پتھر
دنیا میں رہے یادِ خدا ہی نہیں آئی

اب اُس سے کیا جائے تقاضائے وفا کیا
تا عمر جسے یادِ وفا ہی نہیں آئی

بھونچال قیامت کا شفق ٹوٹ پڑا تھا
اچھا ہوا ہم تک یہ تباہی نہیں آئی

●●●

تشنہؔ اعظمی
دین دیال نگر، کھدرا، لکھنؤ-Mob.9335066800

غزل

فکر معاش اور غمِ جاناں کبھی کبھی
ہوتا ہوں اپنے حال پہ حیراں کبھی کبھی

جب سے ہوا علم اسے میرے زخم کا
تحفے میں بھیجتا ہے نمک داں کبھی کبھی

مانا ہر ایک شام ہے روشن تری مگر
ہوتا ہے میرے گھر بھی چراغاں کبھی کبھی

وعدہ سمندروں نے کیا تھا امان کا
آتا ہے لیکن آج بھی طوفاں کبھی کبھی

قابو میں خود کو رکھتا ہوں لیکن جناب من
بندھن کو توڑ دیتا ہے ارماں کبھی کبھی

اک ہوک سی ہے دل میں کہ اس بزم ناز کے
اے کاش ہم بھی ہوتے جو مہماں کبھی کبھی

تشنہؔ سیاہ رات کا عالم نہ پوچھئے
زردی میں ڈھل گیا رخ تاباں کبھی کبھی

●●●

ڈاکٹر مخمور کاکوروی
Mob.9450097929

ہمہ جہت قلم کار: عبدالعلی فاروقی

اگر میں مولانا عبداعلی فاروقی کو ہمہ جہت قلم کار کا نام دوں تو اسے مبالغہ آرائی یا تملق ریزی پر محمول نہ کیا جائے، اس لئے کہ ان کا قلم بیک وقت کئی محاذ پر معرکہ آرائی میں مصروف ہے۔ ان کی شخصیت اور دینی وملی خدمات قابل ستائش ہونے کے ساتھ ان کے رشحات قلم بھی دلکش اور موثر انداز پر مبنی ہوتے ہیں۔ مولانا عبدالعلی فاروقی بیک وقت ممتاز عالمِ دین، جادو بیان مقرر، بلند پایہ خطیب اور صاحبِ طرز انشاء پرداز کی حیثیت سے ملک و بیرون ملک میں اپنی انفرادیت قائم کر چکے ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئیں جو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اِن کتابوں میں تعارف مذہب شیعہ، ہمارے اسلاف، عورت اور پردہ، تاریخ کی مظلوم شخصیتیں، اسلام ہمارا مذہب اور ہم مسلمان قابلِ ذکر ہیں۔ یہی نہیں دارالعلوم فاروقیہ کاکوری کے ترجمان ماہنامہ 'البدر' کے مدیر کی حیثیت سے تقریباً نصف صدی سے صحافت کے میدان میں اشہب قلم کو رواں دواں رکھے ہوئے ہیں۔ اُن کا قلم ابتدا سے بیباک، حق شناس اور حق بیان رہا ہے۔ وہ کسی بھی موضوع یا مسئلہ پر قلم اٹھائیں مگر کبھی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے اور اپنی رائے مفصل اور مدلل طور پر سپرد قلم کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں نہایت دلکش، شگفتہ، اثر انگیز اور حقیقت بیانی پر مشتمل ہوتی ہیں۔ یہی نہیں ماہنامہ البدر میں ''میاں مردم شناس'' کی حیثیت سے طنز وظرافت کے پیرائے میں ''نشتر زنی'' بھی کرتے رہتے ہیں۔

گزشتہ چند برسوں میں مولانا عبداعلی فاروقی نے مختلف موضوعات پر تین کتابیں سپرد قلم کی ہیں جن میں ''یادوں کے جھروکوں سے''، ''میں نے بھی جنھیں دیکھا'' اور زیر نظر کتاب ''اکثر یاد آتے ہیں''۔ ان تینوں کتابوں میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ ان میں مرحومین کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے اور ان کے اوصاف وکمالات کے ساتھ بعض قابل ستائش اور لائق تقلید واقعات کا بیان کیا گیا ہے۔

''اکثر یاد آتے ہیں'' میں مولانا رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلما لکھنؤ کا مقدمہ شامل ہے جس سے کتاب کی وزن ووقار میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کتاب میں چھوٹے بڑے ۲۴ مضامین ہیں ان مضامین میں مولانا عبدالعلی فاروقی نے

اعزا و اقربا، علماء و فضلا، اساتذہ و تلامذہ اور ادبا اور شعرا کے ساتھ دیگر شعبۂ حیات سے متعلق شخصیات و افراد کا ذکر نہایت عقیدت مندانہ اور والہانہ انداز میں کیا ہے۔ انھوں نے اپنی نانی، والدہ، بہن، بہنوئی حفیظ اللہ، اور بھانجے مولانا عبدالمنان قاسمی، جن سے میرے بھی بڑے بے تکلفانہ روابط تھے، کا ذکر بڑے موثر پیرائے میں کیا ہے۔ ان کے بارے میں مولانا کی تحریریں بڑی موثر اور دلآویز ہیں جو مرحومین کو بہترین خراج عقیدت قرار دی جاسکتی ہیں۔

''اکثر یاد آتے ہیں'' کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ تعزیتی تحریریں ہیں، تاثراتی مضامین ہیں یا سوانحی خاکے۔ اس کتاب میں پہلا مضمون ''میری اماں'' یعنی میری نانی'' پڑھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ ایک ۱۹ سالہ بیوہ نے دو سال کی بیٹی کے سہارے تمام عمر کس طرح گزاری ہوگی۔ ان کو اپنی زندگی میں کیسے کیسے مسائل، کیسے کیسے مصائب سے دو چار ہونا پڑا ہوگا۔ لیکن صبر و ضبط کے پیکر ایسی شخصیت کے بارے میں جو معلومات فراہم کی گئی ہے وہ ہمارے معاشرہ کے لئے قابل تقلید بھی ہے اور سبق آموز بھی۔

''ایک بھولے بسرے محسن کی یاد'' اور ''ہمارے حافظ جی'' یہ مضامین بھی ان حضرات سے مولانا عبدالعلی کے تعلق خاطر کو نمایاں کرتے ہیں اور انھوں نے اس سعادت مندی سے ان کا ذکر خیر کیا ہے کہ بیساختہ دل سے داد نکلتی ہے۔

علمائے کرام میں حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب، ان کے جانشین مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا محمد واضح رشید ندوی، شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مفتی سعید احمد صاحب، مولانا محبّ اللہ لاری صاحب، مفتی فضیل الرحمٰن بلال عثمانی صاحب، مولانا محمد متین الحق اسامہ صاحب، مولانا محمد عرفان قاسمی صاحب، پروفیسر عبدالحئی فاروقی، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، حفیظ نعمانی، خواجہ سید محمد یونس، حسین امین، سید ضیاء الحسن، آخر میں ''گل بانگ ازل'' کے حوالے سے علامہ رشید قمر لکھنوی اور محمد احمد خاں ادیب کے ذکر پر کتاب کا اختتام ہوا ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبدالعلی فاروقی کی یادداشت کتنی پختہ ہے اور انھوں نے ان اکابرین کو ضبط تحریر میں لاتے ہوئے ان کی شخصیت کے اوصاف و کمالات اور چھوٹوں سے ان کی شفقتوں، محبتوں اور نوازشوں کے ساتھ ان کے حسن اخلاق اور خردنوازی کے جو واقعات سپرد قلم کئے ہیں، وہ ہمارے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے بعض باتوں کا انکشاف ہوتا ہے اور بعض واقعات کے بارے میں پڑھ کر ان حضرات کی شخصیت کی عظمت اور بلندی کا علم ہوتا ہے۔ یہاں پر چند مثالیں پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مولانا واضح رشید ندوی صاحب کے بارے میں پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت سے

سبکدوش ہوکر مادر علمی ندوۃ العلماء سے وابستہ ہوئے تھے۔شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مفتی سعید احمد صاحب کے بارے میں پڑھ کر نہ صرف ''شیخ الحدیث'' کی اصطلاح سے واقفیت ہوئی بلکہ ان کے متعلق یہ اقتباس آئندہ نسلوں کے لئے عبرت آموز ہے :

''شیخ الحدیث مفتی سعید احمد صاحب کی زندگی کا ایک مثالی و قابل تقلید کارنامہ (جو ان کے اخلاص و للّٰہیت کا شاہد عدل ہے) یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے انھیں جب مالی طور پر فراغت عطا کی تو انھوں نے نہ صرف دارالعلوم دیوبند سے تنخواہ لینا بند کر دی بلکہ پچھلی تمام مدت ملازمت کی لی ہوئی تنخواہ کا حساب کر کے اسے دار العلوم کو واپس کر دیا۔اسی طرح دار العلوم دیوبند آنے سے قبل دارالعلوم اشرفیہ (راندیر گجرات) میں دوران ملازمت لی ہوئی تنخواہ کا حساب کر کے یہ رقم انھوں نے مدرسہ کو واپس کر دی تھی۔ ہماری حرص و ہوس کی دنیا میں مفتی صاحب کا یہ عمل لائق ستائش ہی نہیں قابل تقلید بھی ہے۔''

(...اکثر یاد آتے ہیں ص:۸۳)

کیا مادہ پرستی کے اس دور میں کوئی اس طرح کا مثالی اقدام کر سکتا ہے؟ یا ''ایک با اختیار مہتمم ایسے بھی'' عنوان کے تحت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کے رفیق درس اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم مولانا محبّ اللہ لاری کی مختلف خوبیوں کے ساتھ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہنے کے ساتھ ان کے تقویٰ اور پرہیزگاری کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں:

''ان کے تقویٰ کا حال یہ تھا کہ ہمیشہ دو قلم رکھتے تھے،دارالعلوم کے کاموں کے استعمال کے لئے ایک قلم اور اپنی ضروریات کے لئے استعمال کیا جانے والا دوسرا قلم اور روشنائی۔وہ مسجد میں حاضری کے لئے ٹوپی اور چپل بھی دوسری رکھتے تھے اور مسجد سے واپسی کے بعد اتار کر رکھ دیتے تھے۔''

(...اکثر یاد آتے ہیں ص:۸۹)

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میؔر سے صحبت نہیں رہی

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مولانا عبدالعلی فاروقی کا قلم گذشتہ نصف صدی سے مسلسل رواں دواں ہے اور ان کے قلم سے نئی نئی کتابیں منظر عام پر آرہی ہیں جو معاشرے کے لئے اور علم و ادب کے متلاشی کے لئے بہت سود مند ہیں۔زیر نظر کتاب ''...اکثر یاد آتے ہیں'' ان کا ایسا کارنامہ ہے جسے علمی، مذہبی اور ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ان کا طرز نگارش اور انداز بیان ایسا ہے کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم بھی ایسا لکھ سکتے ہیں لیکن جب کوشش کرتے ہیں تو ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے آخر میں اس شعر میں معمولی ترمیم کے بعد اپنی بات ختم کرتا ہوں ؎

دیکھئے تحریر کی لذت کہ جو اس نے لکھا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

❑❑❑

ارم نعیم (اسسٹنٹ پروفیسر)
گورنمنٹ رضا پی.جی.کالج، رامپور، یو.پی
M0b.7985705617

فروغِ اردو میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی اہمیت وافادیت

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

علامہ اقبالؔ کا یہ شعر آپ کو اس مضمون کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا ہم سب ہر دن کتنی ساری باتیں اپنے گھر، اسکول، کالج مدارس میں بڑے بزرگوں، والدین اور اساتذہ کی زبانی سنتے ہیں اور آج ٹیکنالاجی کے اس دور میں جبکہ ہم میں سے بیشتر کے پاس اسمارٹ فون ہے جس کے ذریعے ہم YOUTUBE پر بہت سارے مقررین کو سنتے ہیں لیکن ہم اپنی زندگی میں اس وقت تک ترقی یافتہ نہیں ہو سکتے جب تک ہم ان اچھی باتوں پر عمل پیرا نہ ہو جائیں۔ اقبالؔ نوجوانوں سے یہی کہنا چاہتے ہیں کہ ہم سب کو آپس میں مل کر محنت و مشقت کرنی چاہئے۔ آپ کو پتہ ہے کہ آج کے دور میں تقریباً دس میں چھ بچے MOBILE ADDICTION کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر چند کہ اس میں بہت ساری ایسی باتیں موجود ہیں جن کی مدد سے وہ کامیاب بھی ہو سکتے ہیں لیکن ہم زیادہ وقت تفریحی مشاغل مثلاً ویڈیو گیمز کھیلنے، فلمیں دیکھنے میں صرف کرتے ہیں اس بات سے بھی بے خبر رہتے ہیں کہ وہ جس ملک کے باشندے ہیں اسے بنانے، سنوارنے اور چلانے میں کتنوں نے قربانیاں دی ہیں اور اب جبکہ وہ ہمارے ساتھ نہیں ہیں تو اس عظیم الشان ملک کی ترویج و اشاعت میں کچھ حصہ یا فرض ہمارا بھی ہے۔ بقول اقبالؔ ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت سے نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ہم سے پہلے بھی اس دیار میں لوگوں کو یہی صبح، دوپہر اور شام میسّر تھے لیکن انہوں نے اپنے گزر اوقات کے لئے بڑے مفید و کارآمد مشغلے اپنائے مثلاً جسمانی ورزش کے لئے کھیل کود، تو ذہنی ورزش کے لئے پہیلیاں بوجھتے، اچھی تصانیف پڑھتے، نئی چیزیں سیکھتے، جس سے ان میں پڑھنے اور سمجھنے کے ساتھ تحریر کرنے کی ترغیب پیدا ہوتی اسی لئے آج ہمارے سامنے ان نادر و نایاب شخصیات کے کارنامے کتابوں کی شکل میں کتب خانوں میں موجود ہیں، وہیں دوسری جانب ہم سائنسدانوں کی ایجادات سے فیضیاب ہو رہے ہیں، مشینوں نے جہاں ایک سمت ہمیں آسانیاں فراہم کیں تو دوسری جانب وقت بچانے میں بہت اہم رول ادا کیا۔ کیا اب یہ آپکا فرض نہیں بنتا کہ ان اوقات کو ضائع نہ کرتے ہوئے مفید و کارآمد چیزوں میں لگائیں؟ آپ کی آج کی محنت کل کا سرمایہ ہوگی جس طرح ہمارے بزرگوں و والدین نے اپنی محنت و جانفشانی سے ہماری روزمرہ کی زندگی کو آسودگی فراہم کی، تو آج ہمیں بھی ان کے لئے اپنے معاشرے اور ملکِ عظیم کے لئے ایسے قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔

یہ دورِ حاضر کی ضرورت ہے کہ ہر شئے میں سائنس و ٹیکنالوجی کی مداخلت ہو لیکن ان کا بجا استعمال کیا جائے ہم کسی بھی

شئے کو خراب تب بناتے ہیں جب وہ بیجا مستعمل ہوں، آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس وقت ہندوستان میں جدید تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ء کے تحت درس وتدریس کے طریقۂ کار بدلے جارہیں جس میں زبان، تہذیب اور ثقافت کی بقا بھی شامل ہے جسکے مطابق طلباء کو سہ لسانی نظام کے تحت تعلیم دی جائے گی تاکہ وہ ایک علاقائی زبان، ایک ملکی زبان اور ایک غیر ملکی زبان سے واقف ہوں۔ لیکن ہم اپنی آبائی زبان اردو کو بھولتے جارہے ہیں ہمارے لئے بڑی ساری تصانیف موجود ہیں جن کا مطالعہ کر ہم اپنے نظریات وافکار کو درست کر صحیح راہ کا تعین کر سکتے ہیں اور یہ تو ادب کی خاصیت ہے چاہے وہ کسی زبان میں ہو مگر اپنی سنجیدہ روی ومتانت سے ہمیں بڑی سوجھ بوجھ فراہم کرتا ہے اس لئے اب جبکہ ہمارے پاس کمپیوٹر، موبائل، انٹرنیٹ جیسی سہولت میسّر ہیں تو کیوں نہ ان کے استعمال سے اپنی کوشش پیہم کو دلچسپ بناتے ہوئے کامیاب ہوں۔

اس لئے اس مضمون میں ایسے چند آلات وذرائع کا ذکر شامل کریں گے جو کمپیوٹر کی دنیا میں تو کافی پہلے وجود پزیر چکے لیکن اردو کی رسائی وہاں تک کچھ تاخیر سے ہوئی۔ اب بھی لوگ ان کے استعمال سے بچ رہیں کیونکہ انگریزی ان کے لئے زیادہ آسان ہے مگر ہم بتاتے چلیں کہ اس کام کے لئے جب اردو'ان پیج' کا وجود ہوا تو اس نے بڑی ساری مشکلات کا حل خود ہی تلاش کرلیا کیونکہ جس کی بورڈ سے ہم انگریزی حروف ٹائپ کرتے ہیں انہی کیز کی مدد سے اردو بھی ٹائپ کرسکتے ہیں۔ اس کے لئے دوسری مشین درکار نہیں، بہر کیف تمہیدی گفتگو کے بعد ہم موضوع کی جانب کوچ کرتے ہیں۔

اردو کے فروغ میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی جب بات آتی ہے تو ذہن میں دو باتیں آتی ہیں ایک، اردو کی کمپیوٹر و انٹرنیٹ پر رسائی، دوسرا ان کی معیار بندی مثلاً ای ترجمہ، ای بکس، ای بازار، ای سرچ، ای خط وکتابت، ای تجارت۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انٹرنیٹ نے اب ایسا ذریعہ پیدا کیا جس سے کسی بھی زبان وادب کو عالمی سطح پر مقام حاصل کرنے میں کوئی دشواری نظر نہیں آتی، آج جبکہ ہر سطح پر کمپیوٹر کی اہمیت و افادیت تسلیم کرلی گئی تو کمپیوٹر کو تعلیمی اعتبار سے دیکھنا، سمجھنا اور استعمال کرنا حد درجہ اہم ہوجاتا ہے۔ اردو میں کمپیوٹر پر دو طرح سے تعلیم دی جاسکتی ہے مثلاً۔

(۱) آن لائن اردو تعلیم۔ اس کام کے لئے CD's,PENDRIVE وغیرہ سے مدد لی جاتی ہے اس کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ بار بار انٹرنیٹ کی مدد نہیں لینی پڑتی۔

(۲) آن لائن اردو تعلیم۔ اس کام کے لئے بہت ساری ویب سائٹس ہیں جن کے ذریعے کبھی طے شدہ رقم ادا کر کے، تو کبھی مفت اردو سیکھ سکتے ہیں۔

پہلے ہم آف لائن ذرائع کی جانب بڑھتے ہیں جن کا تعلق کمپیوٹر کے Hardware سے ہے، تو آیئے جانتے ہیں ان کی خدمات اور استعمال کے طریقۂ کار تاکہ پتہ چلے کہ اردو سیکھنے یا سکھانے میں یہ کس طرح مدد دے سکتی ہیں۔

(۱) سی ڈیز (CD's) - اسے DISC COMPACT یا عرفِ عام میں CD's کے نام سے جانتے ہیں، جب تعلیمی اعتبار سے سی ڈیز کے موضوع پر بحث کی جائے تو اس کی اہمیت واضح ہوتی ہے سی ڈیز جو کہ میگنیٹک سطح کی بنی ہوتی ہیں وہ Data جمع کرنے کا اہم ذریعہ ہیں تعلیمی اعتبار سے ان کی افادیت یوں ہے کہ اس سے کمپیوٹر کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے میں مدد ملے گی آج طرح طرح کے کورسیز (Courses) کی سی ڈیز کا رواج عام ہوتا جارہا ہے اردو کے حوالے سے کنیڈا (Canada) میں سب سے پہلے کوشش **انعام علوی** نے کی تھی

جنھوں نے اردو سیکھنے کے لئے سافٹ ویئر تیار کیا تھا یوں تو انٹرنیٹ پر بہت ساری Websites اردو سکھانے کے حوالے سے موجود ہیں لیکن **جناب انعام علوی** کا سافٹ ویئر ایک اہم مقام رکھتا ہے اس کی خاص بات یہ ہے کی اس میں صوتی و بصری دونوں طریقوں سے اردو سکھانے کی کوشش کی گئی ہے اس میں کمپیوٹر اسکرین پر اردو حروف ظاہر ہوتے ہیں ساتھ میں آوازوں کی مدد سے بھی اس کی شناخت کرائی جاتی ہے۔

بہر کیف آج جبکہ ہر کسی کے ہاتھ میں اسمارٹ فون اور بیشتر جگہوں پر Internet یا WI-FI موجود ہے تس پر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کی اب CD's کی ضرورت نہیں کیونکہ آج بھی ایسی بہت ساری جگہ ہیں جہاں انٹرنیٹ کی رسائی ممکن نہیں اور بعض اوقات موسم کی خرابی ،قدرتی بلائیں مثلاً زلزلے،سیلاب زدہ علاقوں میں انٹرنیٹ کی رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔ ایسے تمام مقامات یا موقعوں پر CD's تعلیمی راستوں کی رکاوٹوں کو ختم کرتے ہوئے اسے تسلسل فراہم کریں گی کیونکہ CD's کسی بھی مواد کے جمع اور ریکارڈ کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں جن سے وقتاً فوقتاً فیضیاب ہوا جاسکتا ہے۔

اس لئے جہاں ایک سمت Youtube پر بہت ساری Videos موجود ہیں مگر تب بھی CD's کی اہمیت پر کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کیونکہ ان Videos سے مستفید ہونے کے لئے Internet درکار ہے تو وہیں اکثر چینل کچھ عرصے کے بعد Video ہٹا بھی دیتے ہیں لیکن CD's میں جمع کیا ہوا مواد آپ ایک وقت میں کئی Disc's میں کاپی کر کے رکھنے کے ساتھ بلا Internet جب چاہیں دیکھ سکتے ہیں، Personal Computer یا Laptop تک کوئی ایسا کمپیوٹر ماڈل نہیں جس میں سی ڈی Insert کرنے کی سہولت موجود نہ ہو۔

(۲) پین ڈرائیو (Pen drive)- یہ بھی Data Storage کے حوالے سے ایک نہایت کارآمد شئے ہے اپنے مختصر سائز کے وجہ سے کہیں بھی لے جائی جاسکتی ہے۔ اس میں عموماً 32GB,16GB,8GB تک کا مواد محفوظ کیا جاسکتا ہے اس میں موجود Internet Files کی متلاشی نہیں ہوتی، آج Power Point Presentation کے لئے یہ ایک بہت اہم ذریعہ ہے اسے ہم دریا کو کوزے میں سمونے کے مثل کہہ سکتے ہیں۔

آف لائن کے بعد جب ہم کمپیوٹر کے آن لائن ذرائع اردو تعلیم کی جانب بڑھتے ہیں تو سب سے پہلا مسئلہ کمپیوٹر میں اردو حروف کو داخل کرنے کا تھا اس کام کو جس سافٹ ویئر نے اولین سرانجام دیا، وہ Inpage ہے جس کا تذکرہ کئے بغیر ہم آن لائن Computer Learning سے واقف نہیں ہو سکتے۔

(۱) ان پیج (Inpage)- یہ سافٹ ویئر پہلی دفعہ ۱۹۹۴ء میں لانچ کیا گیا جس کے ذریعے اردو،عربی، فارسی، پشتو، بلوچی، سندھی، پنجابی وغیرہ زبانوں کی ٹائپنگ کمپیوٹر میں کی جا سکے،جس کی ابتدا کا سبب پاکستانی اخبارات کی چھپائی کو آسان بنانا تھا لیکن اس نے کمپیوٹر کی دنیا میں اردو کی رسائی کو ممکن بنایا، جس کی مدد سے اردو کمپوزنگ آسان ہوئی اور سب سے خاص بات یہ ہے کہ ان پیج Keyboard انگریزی Keyboard کے شانہ بہ شانہ چلی مثلاً جہاں "A" نے ''الف''، "B" نے ''ب''، "T" نے ''ت'' جیسے حروف کی خدمت انجام دی ،اس لئے اردو ٹائپنگ بھی انگریزی کی مانند آسانی سے کی جاسکتی ہے۔

(۲) اردو سرچ انجن (Urdu Search Engine)-

انٹرنیٹ پر کسی چیز کی تلاش کے لئے سرچ انجن کا سہارا لیا جاتا ہے www.google.com کو سرچ انجن کے لحاظ سے اہم مقام حاصل ہے اس کے علاوہ Altavista،Exitic،www.yahoo.com پر بھی یہ سہولت ہے جس کی مدد سے آپ کسی بھی موضوع پر معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔Google نے اب جبکہ کئی زبانوں میں Search Engine تیار کر کے ان زبانوں میں یہ آسانی فراہم کی اس میں اردو کو بھی جگہ دی گئی یعنی آپ اردو میں Search کر سکتے ہیں۔اس کے علاوہ اردو سرچ کے لئے اگر آپ اردو ہی میں لکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے Unicode کے اردو Keyboard سے مدد لینی ہوگی۔

Search Engine وقتاً فوقتاً ایسے پروگرامز چلاتے ہیں جو انٹرنیٹ پر موجود Websites کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔ان پروگرامز کو Spider یا Crawler کیا جاتا ہے۔

Crawler ملنے والے Hyperlinks کے ذریعے Worldwide web پر اپنا سفر کرتے ہیں جو Graphics یا Intimation Files پر مشتمل ہو۔جب اس کو کوئی Web page ملتا ہے تو وہ اس کا URL یا Text Search Engine کے ترتیب والے Software کو بھیج دیتا ہے اس کو Indexing Software کہا جاتا ہے۔الفاظ کی بنیاد پر اس ترتیب کو اشاریہ یا Index کہتے ہیں۔جب ہم کسی Search Engine میں جاتے ہیں تو وہاں ایک سے زائد الفاظ یا کوئی جملہ ٹائپ کر کے اس کی بنیاد پر تلاش کر سکتے ہیں۔Internet پر Search کا معاملہ کچھ سمندر میں غوطہ زنی کی طرح نظر آتا ہے جہاں اندازہ کے مطابق ہی کچھ تلاش کرنے کی کوشش غوطہ خور کرتا ہے اور کوشش کے نتیجے میں اسے جواہر اور نہ جانے کتنی قیمتی ''اشیاء'' حاصل ہو جاتی ہیں اردو کے حوالے سے Internet یا Search کرنے پر بہت سارا مواد مل جاتا ہے،اور مستقل نیا مواد شامل کیا جا رہا ہے اس کام میں اب زیادہ دشواری اس لئے نہیں رہی کیونکہ Google کے Search Engine میں اُس لفظ کو ٹائپ کرتے ہی ہمارے سامنے مختلف Resources یا Websites کی جانب سے اس لفظ کے کئی معنی آموجود ہوتے ہیں اور ہم جس بھی Website سے اس لفظ کے معنی ومفہوم کو سمجھنا چاہیں اس کا انتخاب کر کے اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔

(۳)ای لائبریری(DIGITAL LIBRARY)-آج اس کی افادیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور COVID19 کے بعد سے اس کی ضرورت کو حد درجہ محسوس کیا گیا ہے اور اب عالمی سطح پر اس کے متعلق بڑی تیزی سے کام ہو رہے ہیں اور کتب خانوں کو آن لائن کیا جا رہا ہے۔انٹرنیٹ کے ذریعے لائبریری کی سہولیت اتنی اچھی چیز ہے جس کی مدد سے وقت کی بچت ہوتی ہے یہاں ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کسی لائبریری میں کتاب کی مثال کے طور پر دس کاپیاں موجود ہوں تو اس سے بہ یک وقت دس ہی لوگ استفادہ کر پائیں گے لیکن اگر اس کو DIGITAL سہولت سے مزیّن کر دیا جائے تو دنیا میں جتنے لوگوں کو اس کی ضرورت ہو وہ اس کتاب کا مطالعہ کر فائدہ اٹھا سکیں گے۔اب جبکہ آن لائن تعلیم کی بات ہو رہی ہے تو ایسی لائبریریز کا آن لائن ہونا نہایت ضروری ہے۔ہم اس بات سے باخبر ہیں کہ زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک تعلیمی نظام میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں لیکن اس میدان میں انقلاب آچکا ہے۔آج چیٹنگ کے ذریعے تعلیم دینے کی سہولت ہے۔

انٹرنیٹ کے ذریعے یونیورسٹیز اور دوسرے تعلیمی ادارے آپس میں کسی پہلو پر بات چیت کر خیالات کا تبادلہ کر سکتے ہیں اور Tele- Confrence کی مدد لی جا سکتی ہے۔ اس طرح سائنس ٹیکنالوجی کے بڑھتے قدم نے تعلیمی میدان میں اہم کردار ادا کیا ہے تمام علوم کو اس سے وابستہ کر دیا گیا ہے www.kitaben.ifastnet.com میں اردو کتابیں شامل کرنے کی کوشش کی گئی، جن میں تنقیدی، شعری، نثری، افسانہ، ناول سے لے کر مذہبی مضامین تک کو جگہ دی گئی ہے، یہ برقی کتابوں یا ای لائبریری کے طور پر اچھی Website ہے۔

(۴) ای بکس (E- BOOKS)- جس رفتار کے ساتھ ٹیکنالوجی آگے بڑھ رہی ہے اور انسانی زندگی پر اپنے اثرات مرتب کر رہی ہے ان متاثر کرنے والی چیزوں میں ایک اہم چیز E-Books کو حاصل کرنا ہے موجودہ دور میں E-Books انٹرنیٹ کے ذریعے بڑی مشہور ہو رہی ہیں کیونکہ آج ہر شخص آسانی سے کتابوں تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے انٹرنیٹ پر اردو کے تعلق سے ای بُکس فراہم ہیں جو کہ www.amazon.com پر دی گئی ہیں. اس سلسلے میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیں کہ وہ ادارے جو پبلشنگ کے کاموں کو انجام دیتے ہیں اگر وہ اس سلسلے میں دلچسپی لیں تو بات کچھ بنتی نظر آئے گی کیونکہ یہ لوگ کتاب کی پوری کمپوزنگ (Composing) کرواتے ہیں اگر اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی ای بُکس تیار کروائی جائیں تو یہ اہم کام ہوگا۔

ہندوستان میں حکومت ہند کا ادارہ NCPUL اردو کے حوالے سے ای بُکس تیار کروا رہا ہے جس کے ذریعہ شائع کی جانے والی کتابوں سے دنیا بھر کے اردو قارئین فائدہ اٹھا سکتے ہیں کیونکہ قارئین مُفت میں یہ کتابیں DOWNLOAD کر ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اسکے علاوہ بھی آن لائن BOOKSHOP کی سہولت فراہم کرنے کی ضرورت ہے جو CREDIT CARD کی مدد سے آسانی سے لی جا سکیں جو اردو کے فروغ میں ممدو معاون ثابت ہوگا۔ اس طرح کی سہولیات اردو کی کچھ ویب سائٹس پر فراہم بھی ہیں مثلاً۔

(1)www.emarkaz.com(2)www.urdupcorner.com

(3)www.urdupoint.com(4)www.urduclassic.com

کے نام اہم ہیں۔

(۵) آن لائن اردو ڈکشنری (ONLINE URDU DICTIONARY) اردو کے حوالے سے لغت اور ترجمے کا کام www.urduword.com پر ملتا ہے اس میں URDU TRANSLATION کے علاوہ ڈکشنری کی بھی سہولت ہے جس میں کافی حد تک کام ہوئے ہیں۔

(۶) ای ٹرانسلیشن یا مشینی ٹرانسلیشن (E-TRANSLATION)- یہ ایک اہم ضرورت بن گیا ہے اس سے اردو والوں کا منحرف ہونا نا قابلِ تلافی نقصان کا باعث ہوگا. ہم اس سے دور رہ کر ارتقا کی منزلیں کیسے سر کریں گے کیونکہ بغیر اس کے دوسری زبانوں کے ادب کو جاننا سمجھنا ممکن نہیں، ٹرانسلیشن کی اہمیت ہر سو واضح اور صاف نظر آ رہی ہے۔ جس قدر عالمی سطح پر MULTI NATIONAL COMPANIES اپنے قدم جما رہی ہیں، دنیا کی تمام زبانوں کی اہمیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ عالمی سطح پر اہم زبانیں تصور کی جانے والی زبانوں کا تو الگ مقام اور الگ اہمیت ہے۔

(۷) انٹرنیٹ بلاگنگ (INTERNET BLOGGING)- انٹرنیٹ کی دنیا میں بلاگ کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے یہ روزنامچے (DAIRY) جیسی چیز ہے جسے

ONLINE WEBSITES پر برقرار رکھا جاتا ہے اس کو WEB LOG کے نام سے بھی جانتے ہیں جو مختصراً BLOG کہا جاتا ہےاس کی شروعات کسی شخص کے خیالات کے اظہار اور CYBER SPACE میں دوسروں کے ساتھ اپنے خیالات و نظریات کے تبادلے کی ایک شکل پر ہوتی ہے۔ہم اپنے بارے میں،روزمرہ کے کاموں،دوست واحباب کے بارے میں بات کر سکتے ہیں لیکن اس قسم کی معلومات کا تعلق دنیا سے ہوتا ہے جو کہ محض دوستوں کی دلچسپی کا باعث نہیں ہوسکتی ہے۔اس میں لوگ Technology کے بارے میں خیال کا تبادلہ کرتے ہیں PERSONAL BLOGS بھی مستقل مقبولیت حاصل کر رہے ہیں اور اب بہت سارے اردو ادیب و شاعر اپنے خیالات کا اظہار Blogs پر پیش کررہے ہیں۔

اردو میڈیا میں بھی Blogs کی اہمیت بڑھ رہی ہے اخبارات میں کام کرنے والے لوگ نامہ نگار، کالم نویس کے Blogs شائع ہوتے ہیں ان میں پاکستان کی کچھ اردو Websites القمر، جنگ اور دیگر Websites پر Blogs آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں۔تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ اپنی آزادرائے دینے یا صحافت کے میدان میں Blogs کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں خود ہمارے ملک میں کتنے سارے Bloggers ہیں جو ہندوستانی میڈیا پر نظر رکھتے ہیں۔

(۸) **ای میل E-MAIL**- آج کی دنیا میں سب سے زیادہ مقبول ترین ترسیل کا ذریعہ ہے جس کی مدد سے لمحوں میں برقی پیغام کہیں بھی بھیجا جا سکتا ہے۔اس لئے دیگر زبانوں کی طرح اردو میں بھی اس کی سہولت ہوگئی ہے اور بہت سارے لوگ ای میل اور چیٹنگ کے لئے رومن،اردو و ہندی رسم الخط استعمال کرتے ہیں۔

(۹) **ریختہ (Rekhta)**- اس موقع پر ہم ریختہ کو کیوں کر نظر انداز کر سکتے ہیں بقول **لالہ مادھورام جوہر**''**اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی**'' قدیم دور میں لفظ ریختہ اردو کی بگڑی ہوئی شکل کو کہتے تھے لیکن رفتہ رفتہ اس میں نکھار وندرت آتی گئی اور وہ ریختہ سے اردو ہوگئی لیکن آج ریختہ نامی Website وجود پزیر ہو چکی ہے اور اس کی ارتقائی شکل میں اب اسکا ایک Application Software ہے جسے ہم Google Playstore کی مدد سے Download کر کے اپنے موبائل میں محفوظ کر سکتے ہیں،نہیں تو جب اردو کی کسی کتاب،رسالہ یا شاعری کا مطالعہ کرنا ہو تو Google کے Search Box میں www.rekhta.org ٹائپ کر کے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔اس کے خالق **سنجیو صراف** نے اسے پہلی دفعہ **اا جنوری ۲۰۱۳ء** کو لانچ کیا جس کا مقصد اردو، فارسی و ہندی کے قدیم ترین ادب کو ہندوستان کی ہر چھوٹی بڑی لائبریری سے نکال کر PDF (Softcopy) کی شکل میں نہ صرف منظر عام پر لانا بلکہ قارئین کی پہنچ کو ان تصانیف تک ممکن بنانا تھا۔اس کام کے لئے جہاں ان کے کارکنوں نے اس قلیل مدت میں بیش بہا ادبا و شعرا کی کتاب وکلام جمع کر دیا وہیں بلاکسی قیمت یا فیس کی ادائیگی کے ہم مطلوبہ کتاب کا نام ریختہ کے سرچ باکس میں ٹائپ کر بڑی آسانی سے اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ہم **سنجیو صاحب** کی اس ایجاد اور کاوش کے لئے ان کے جتنے شکر گزار ہوں کم ہے کیونکہ انہوں نے اس کام کے مکمل کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ Rekhta میں نت نئے تجربے کر اسے بہتر سے بہترین بنایا اور یہ کام جاری ہے۔مثلاً پہلے ہم کسی غزل کا مطالعہ کرتے تو مشکل الفاظ کے معنی غزل کے اختتام پر مندرج ہوتے لیکن آج ہم کسی ایک لفظ پر جوں ہی Touch کرتے ہیں تو فوراً اس سے جڑی معلومات و

معانی ہمارے سامنے اردو و ہندی اور انگریزی زبان میں آجاتے ہیں۔اس لئے Rekhta نے کمپیوٹر پر صرف اردو کتابوں کے مطالعے کا موقع فراہم نہیں کیا بلکہ اس نے ہندی سے اردو اور انگریزی سے اردو سیکھنے کے بھی در وا کئے تاکہ اردو کے قارئین کے علاوہ اردو کے شائقین بھی اس سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔

تو یہ ہیں وہ آلات و ذرائع جن کی مدد سے آپ بھی کمپیوٹر پر اردو لکھنا پڑھنا سیکھ کر ایک طرف تو اپنی موروثی زبان سے واقف ہوسکیں گے اور دوسری جانب ترقی کی نئی شاہراہ پر گامزن ہوسکیں گے، اب بھی اردو ادب کی بیشتر کتابیں دوسروں کی پہنچ سے باہر ہیں کیونکہ وہ اردو نہیں جانتے،اس لئے آپ میں بہت سارے افراد ترجمے کا فن سیکھ کر کتابوں کے ترجمے کا کام بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ بقول حالیؔ ’’جدھر کو زمانہ گھومے تم بھی ادھر کو گھوم جاؤ‘‘ اس لئے یہ اس دور کی ضرورت بھی ہے اور وقت کا تقاضا بھی کہ آپ موبائل کا استعمال صرف وقت گزاری کے لئے نہ کریں بلکہ اپنے اجداد کی بنائی روش پر ان جدید آلات کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلیں اور ثابت کر دکھائیں کہ آپ بھی کچھ کر گزرنے اور کامیاب ہونے کا دم خم رکھتے ہیں بقول شاعر:

بدلتی رہتی ہیں قدرِ رحیل وقت کے ساتھ
زمانہ بدلے گا ہر شئے کا نام بدلے گا

اس لئے جدت پسندی یا تبدیلی ہرگز بُری نہیں بشرطیکہ آپ اس کا صحیح استعمال کریں اور زندگی ایک بھی لمحہ ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتی کیونکہ جنہیں کچھ بنانا یا کر گزرنا ہے ان کے لئے یہی زندگی کافی ہے اس لئے آپ کو بغیر رُکے اور تھکے بڑھتے جانا ہے کیونکہ:

جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
(علامہ اقبالؔ)

□□□

سعدیہ صدف
کولوٹولہ اسٹریٹ، کولکاتا- Mob.9831365693

غزل

مرا دل دھڑکتا ہے کس قدر ترے نام پر، مرے بے خبر
ترا نام جپتی رہوں گی میں، یوں ہی عمر بھر، مرے بے خبر

میں تو مٹ گئی تری چاہ میں، میں دھواں ہوئی تری راہ میں
مرے حال کی تجھے کیا خبر میں ہوں در بدر، مرے بے خبر

مری فکر کا تو ہی ترجماں، مرے بخت کی تو ہی کہکشاں
مرے شعر کا تو ہی حرف گر، مرے ہم سفر، مرے بے خبر

مری بے بسی کی ہے انتہا، تری اک نگہ کی ہوں طالبہ
ذرا دیکھ لے مجھے اک نظر، مرے منتظر، مرے بے خبر

ترے آگے کیا ہے بساطِ من، مجھے ایک تیری ہی ہے لگن
تو چہار سو، مرے ماہ رو، مرے مہرور، مرے بے خبر

ترے دم سے کیف سخن وری، ترے ہی طفیل ہے دلکشی
مرے حرف تجھ سے ہیں معتبر، مرے نقش گر، مرے بے خبر

یہی ایک خواہش سعدیہؔ، ترا دل کبھی نہ ہو غم زدہ
میں صدف ہوں اور ہے تو گہر، مرے سیم و زر، مرے بے خبر

●●●

ایم اے کنولؔ جعفری

نیندرو، بجنور (یوپی)-Mob.9917767622

شاخ میں اَٹکی پتنگ

دُکان بند ہوئے ایک ہفتہ ہوگیا تھا۔ وہ دُکان جس سے اہل خانہ کی روزی روٹی چل رہی تھی، وہ دُکان جس کے تعلق سے گھر کے دیگر کام انجام پا رہے تھے۔ وہ دُکان جو بچوں کی تعلیم کا ذریعہ بھی تھی۔ پرچون کی وہ دُکان اب بند تھی۔ دکان کھولنے والا اس دنیا میں نہیں رہا۔ وہ سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر دُور جا چکا تھا۔ وہاں! جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

دُکان بند تھی۔ کب تک بند رہے گی؟ کھلے گی بھی یا نہیں؟ کون کھولے گا؟ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ شفیع الرحمٰن کی پرچون کی دُکان جس مارکیٹ میں تھی، وہاں کے دُکان دار جمعہ کے روز اپنی دُکانیں بند رکھتے تھے۔ جمعہ کے تعلق سے وہ بھی اپنی دُکان بند رکھتا تھا۔ اُس نے سن رکھا تھا کہ جمعہ ہفتے کے ساتوں دنوں کا سردار ہے۔ قریب قریب سبھی مسلمان جمعہ کے دن اپنا کام دھندا بند رکھتے اور جمعہ کی نماز کی تیاری میں مشغول رہتے تھے۔ جمعہ کی نماز سے قبل سفر اور خرید و فروخت کرنے کو بہتر نہیں مانا جاتا، اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ نماز سے پہلے اپنی دُکان کھول لیتا۔

رمضان کا آخری جمعہ تھا۔ جمعتہ الوداع کے روز تو دُکان کھولنے کا کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔ شفیع الرحمٰن نے الوداع جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے حسب معمول غسل کیا۔ سفید رنگ کے صاف ستھرے کپڑے پہنے، آنکھوں میں سرمہ لگایا، بدن اور کپڑوں پر خوشبو لگائی۔ دن کے 12.30 بجتے ہی اَذان شروع ہوگئی۔ اُس نے پیروں میں چپل ڈالے اور نماز کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ گھر کے سامنے ہی جامع مسجد تھی۔ وہ دیگر نمازیں بھی اسی مسجد میں پڑھتا تھا۔

شفیع الرحمٰن نے داہنا قدم آگے بڑھاتے ہوئے چلنا شروع کیا۔ وہ ابھی گھر کے آنگن میں ہی تھا کہ سینے میں درد کی شکایت محسوس ہوئی۔ درد تیز ہوا، تو اس نے داہنا ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔ درد شدت اختیار کرتا ہوا برداشت سے باہر ہو گیا۔ اسی حالت میں وہ نیچے کی جانب بیٹھتا چلا گیا۔ اچانک شوہر کو زمین پر بیٹھے دیکھ نازیہ گھبرا گئی۔ وہ تیز قدموں سے شوہر کے پاس آئی، شوہر کو پکڑا اور دونوں ہاتھوں کا سہارا دے کر پاس پڑی چارپائی پر لٹا دیا۔

’آپ کو کیا ہوا ہے؟‘ نازیہ نے دریافت کیا۔

’سینے میں درد ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل پھٹا جا رہا ہے۔‘ شفیع الرحمٰن نے بمشکل تمام اتنا کہا اور کراہنے لگا۔

جسم پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ کچھ ہی دیر میں بدن پسینے میں نہا گیا۔ شوہر کو پسینے میں تربہ تر دیکھ کر اُسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ یہ اچھی علامت نہیں تھی۔ اس کے ابو دِل کے مریض تھے۔ موت والے دن انھیں بھی سینے میں درد کے

ساتھ اسی طرح پسینہ آیا تھا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے پسینے میں نہائے ہوئے ہوں۔ والد کی موت کا منظر آنکھوں کے سامنے آتے ہی وہ بے چین ہوگئی۔ اس کے باوجود اُس نے ہمت نہیں ہاری۔

نازیہ نے اپنے حواس درست رکھتے ہوئے جیٹھ کو آواز لگائی۔ 'بھائی صاحب! بھائی صاحب!! جلدی آیئے!!! دیکھئے آپ کے بھائی کو کیا ہوا ہے؟'

نازیہ کی آواز سن کر مطیع الرحمٰن دوڑا چلا آیا۔

'کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ شفیع کیا ہوا ہے؟ تم ٹھیک تو ہو، شفیع؟' مطیع نے چھوٹے بھائی سے پوچھا۔

'پتہ نہیں بھائی جان! کیا ہو رہا ہے؟ سینے میں درد بڑھتا جا رہا ہے اور میں پسینے میں شرابور ہوں۔ مجھے اپنے حالات ٹھیک نہیں لگ رہے ہیں۔

مطیع بھائی کو اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گیا۔ اُس نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا، 'تمھیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم تمھیں اسپتال لے کر چل رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ای رکشا لاتا ہوں۔' وہ جلدی سے گھر سے باہر نکلا اور چوراہے پر کھڑے ای رکشا والے کو آواز دی۔

'ای رکشا! ای رکشا! جلدی آؤ!! جلدی آؤ!! اسپتال چلنا ہے!!!' مطیع نے زور سے آواز لگائی۔

'آ... یا...... آ...... یا.... آیا جی! کیا بات ہے؟' ای رکشا والے نے پوچھا۔

'شفیع کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ شاید دل کا دورہ پڑا ہے۔ اُسے جلدی اسپتال لے جانا ہے۔' مطیع نے جواب دیا۔

ای رکشا والے نے دروازے کے باہر ای رکشا روک دیا۔ مطیع اُسے اپنے ہمراہ لے کر گھر کے اندر گیا۔ دونوں نے شفیع کو سہارا دے کر اُٹھایا۔ کسی طرح سنبھال کر باہر لائے اور ای رکشا میں بٹھا دیا۔ مطیع جلدی سے بھائی کے برابر میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں نازیہ بھی برقع پہن کر آ گئی۔ وہ سامنے کی سیٹ پر بیٹھی ہی تھی کہ رُومانہ بھی روتی ہوئی رکشا میں بیٹھ گئی۔

نازیہ نے رُومانہ کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ وہ اس کے ابو کو اسپتال لے جا رہے ہیں۔ جب تک وہ واپس آئیں، اُسے دو برس کے ارقم اور چار سال کے ارحم کو سنبھالنا ہے۔ اتنا سن کر رُومانہ ای رکشا سے نیچے اتر گئی اور گھر میں داخل ہو کر دونوں بھائیوں کو اپنے بدن سے چپٹا لیا۔

رُومانہ گاؤں کے پرائمری اسکول میں پڑھتی تھی۔ وہ چوتھے درجہ کی طالبہ تھی، جبکہ ارحم نرسری میں زیرِ تعلیم تھا۔ الوداع جمعہ کی تعطیل کی وجہ سے بچے گھر پر تھے۔ مطیع راستے بھر شفیع کا سینہ دباتے اور منہ پر منہ رکھ کر سانس چھوڑتے رہے۔ ای رکشا والا گلیوں سے ای رکشا نکالتے ہوئے جلدی سے اسپتال لے گیا۔ مطیع اور ای رکشا والے نے شفیع کو سنبھالا۔ نازیہ نے اسٹاف کو مدد کے لیے پُکارا۔

اسٹاف کا عملہ شفیع کی نازک حالت دیکھ کر اُسے ایمرجنسی وارڈ میں لے گیا۔ اسی دوران کئی ڈاکٹر آ گئے۔ ایک ڈاکٹر نے مریض کی نبض دیکھی۔ نبض کا دُور تک پتہ نہیں تھا۔ دوسرے نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ تیسرے ڈاکٹر نے آنکھوں کی پتلیاں کھول کر دیکھیں۔ دل کی دھڑکن بند اور آنکھوں کی پتلیاں ٹھہر چکی تھیں۔ ڈاکٹروں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ ایک ڈاکٹر نے بدن پر پڑے کپڑے سے مریض کے چہرے کو ڈھک دیا۔ ایک کے بعد ایک سبھی

ڈاکٹر کمرے سے باہر آ چکے تھے۔ان کے چہروں پر مایوسی تھی۔

نازیہ اور رُومانہ باہر کھڑی تھیں۔ڈاکٹر کی زبانی مریض کے انتقال کی خبر سنتے ہی نازیہ بے ہوش ہوگئی۔رُومانہ ماں سے چپٹ کر رونے لگی۔ بھائی کے ساتھ چھوڑ جانے سے مطیع الرحمٰن کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔اُس نے بھتیجی کو اُٹھا کر سینے سے لگالیا۔

لاش کو اسپتال کی وین میں رکھ کر گھر لایا گیا۔لاش آتے ہی گھر میں رونا پیٹنا شروع ہوگیا۔اسی دوران مسجد میں خطبے کی اذان شروع ہوگئی۔اذان کے الفاظ کانوں میں پڑتے ہی مطیع الرحمٰن کے قدم مسجد کی جانب اُٹھ گئے۔

دیر سے جمعہ کی نماز پڑھنے جانے والے لوگوں نے شفیع الرحمٰن کے گھر سے خواتین کے رونے کی آواز سنی۔ایک شخص نے مطیع الرحمٰن سے رونے کا سبب پوچھا۔حقیقت واضح ہوتے ہی اُس کی آنکھوں میں بھی نمی آگئی۔فرض ادا کرنے کے بعد اُس شخص نے امام صاحب کو شفیع کے انتقال کی خبر دی۔

امام صاحب کے ذریعہ دُعا مانگتے ہوئے شفیع الرحمٰن کے انتقال، انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام اور پسماندگان کو صبر جمیل کی دُعا کے ساتھ شفیع کے اچانک انتقال کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔نماز پڑھنے کے بعد شفیع کے گھر دوست واحباب، محلے کے لوگ اور اُسے قریب سے جاننے والے افراد کا میت دیکھنے کے لیے تانتا لگ گیا۔زیادہ تر لوگ اس کے عمل اور کردار کی تعریف کر رہے تھے۔روزے میں انتقال کو اچھی موت بتایا جا رہا تھا۔

مطیع الرحمٰن نے تمام رشتے داروں کو بھائی کے انتقال اور اگلے روز ظہر کی نماز کے بعد میت کو سپرد خاک کرنے کی خبر پہنچائی۔قریبی رشتے دار شام تک پہنچ گئے۔باقی اگلے دن آ گئے۔

قبر تیار ہو چکی تھی۔نہلانے کی تیاری کی گئی۔فرش میں غسل کا پانی جمع ہونے کے لیے پھاوڑے سے گڑھا کیا گیا۔اس کے بعد مسجد سے لائے گئے نہلانے کے تختے کو ٹھیک سے جمایا گیا۔بیری کے پتے ڈال کر گرم کیے گئے پانی کے برتن کو تختے کے قریب رکھا گیا۔کئی لوگوں نے لاش کو اُٹھا کر تختے پر لٹایا۔

غسال نے میت لے جانے والی مسہری پر حسب معمول کفن پھیلایا۔اس کے بعد لاش کے اُوپر نیا کپڑا ڈالا اور ازار کو نیچے کی جانب کھسکا کر بدن سے الگ کر دیا۔قمیص اور بنیان کو قینچی سے کاٹ کر الگ کیا گیا۔اس کے بعد نہلانے کا عمل شروع ہوا۔نہلانے کے بعد میت کو مسہری پر لٹاتے ہوئے کفن پہنایا گیا۔کفن سے فراغت کے بعد اہل خانہ رشتے دار، دوست واحباب اور محلے کے لوگوں نے جسد خاکی کے آخری دیدار کیے۔

اسی دوران ظہر کی اذان ہوگئی۔لوگوں نے مسہری کو اُٹھایا اور اسے مسجد کے سامنے لاکر رکھ دیا۔ظہر کی نماز کے بعد امام صاحب نے نماز جنازہ ادا کرائی۔نماز کے بعد چار لوگوں نے مسہری کے چاروں کونے پکڑے اور اسے اُٹھا کر اپنے کندھوں پر رکھ لیا۔اب ان کا رُخ قبرستان کی جانب تھا۔راستے میں لوگ کندھا بدلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔آخر کار قبرستان آ گیا۔

لوگوں نے قبرستان میں داخل ہوتے ہوئے وہاں مدفون افراد کو سلام کیا۔قبر پوری طرح تیار تھی۔مسہری کو قبر کے

نزدیک رکھنے کے بعد کئی لوگوں نے میت کو لحد میں اُتار دیا۔ کفن کے سرہانے کا بند کھول دیا گیا۔کئی افراد نے ایک بار پھر میت کے چہرے پر نظر ڈالی۔کفن کو درست کرتے ہوئے لحد کے اُوپر تختے رکھے گئے۔ بعد میں پھاوڑے سے مٹی ڈالی گئی۔ آخر میں وہاں موجود لوگوں نے دونوں ہاتھوں سے تین تین مرتبہ مٹی اُٹھا کر قبر پر ڈالی۔

قبر کو آخری شکل دینے کے بعد وہاں موجود لوگوں نے فاتحہ پڑھ کر میت کی رُوح کو ثواب پہنچایا اور پھر گھر کی جانب چل دئے۔مہمانوں کے لیے کھانے کا نظم کیا گیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوکر زیادہ تر لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے۔شام کے وقت نازیہ کا بھائی اپنی بیوی کے ساتھ گھر چلا گیا۔دونوں بہنیں بیوہ کے پاس ٹھہر گئیں۔

دوسرے روز بڑی بہن سعدیہ نے نازیہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا،'نازیہ! اَللّٰہ کی مرضی یہی تھی۔شفیع بھائی کا ساتھ یہیں تک تھا۔اب گھر کی کفالت اور دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔تمھیں ہی گھر سنبھالنا ہے۔عدت پوری کرنے کے بعد دُکان کھول لینا۔شہروں میں کتنی ہی عورتیں دُکانوں پر کام کرتی ہیں۔تمھارے سامنے بچوں کو پڑھانے کے علاوہ گھر کا خرچ چلانے کی ذمہ داری بھی ہے۔'

دوسری بہن ساقیہ نے بھی اسی طرح کی صلاح دی۔ دونوں بہنوں کی بات سن کر نازیہ خاموش رہی۔اس کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلا۔شوہر کے ساتھ چھوڑ جانے کا غم اُسے کچھ سوچنے ہی نہیں دے رہا تھا۔اسی طرح کئی روز گزر گئے۔ دونوں بہنیں بھی کب تک رہتیں۔آخر کار انھوں نے بھی اپنے گھر کی راہ لی۔

روانہ ہونے سے قبل دونوں نے نازیہ کو گلے لگایا اور سمجھاتے ہوئے بولیں،'نازیہ! اپنا گھر چھوڑ کر بھائی کے گھر آنے کی حماقت مت کرنا۔والدین ہوتے ،تو زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ تیری دلجوئی ہو جاتی۔تو اگر چلی بھی گئی،تو وہاں نبھاؤ نہ ہو سکے گا۔ تجھے تو معلوم ہے ہمارا ایک ہی بھائی ہے۔اس کا کام دھندا بھی اچھا نہیں رہتا۔اس کے گھر کا نظام بھی ٹھیک نہیں ہے۔ بھابی کو نندوں کا گھر آنا پسند نہیں ہے۔ ہم میں سے اگر کوئی دو چار روز کے لیے چلا بھی جاتا ہے،تو بھابی سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔ ہمارے آنے کے بعد میاں بیوی کے درمیان مہابھارت چھڑ جاتا ہے۔ پتہ نہیں بھائی یہ سب کیسے برداشت کرتا ہے۔شوہر کا ساتھ یہیں تک تھا۔ یہ تیرا گھر ہے۔اپنے گھر میں رہ۔بچوں کی پرورش کر۔'

نازیہ نے اثبات میں سر ہلایا،مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ایک کے بعد ایک دونوں بہنوں نے رُومانہ،ارحم اور ارقم کے سر پر ہاتھ پھیرا، پیار کیا اور گھر سے باہر نکل گئیں۔

دن تو کسی طرح بچوں کے ساتھ گزر جاتا،لیکن رات کاٹے نہیں کٹتی۔طرح طرح کے خیال آتے۔شوہر کے ساتھ گزرے شب و روز آنکھوں میں گردش کرتے رہتے۔ اَللّٰہ کے حکم کے آگے سرنگوں ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

ہفتہ بھر بعد دُکان کھلی۔رُومانہ نے دُکان کھول لی تھی۔ دُکان کھلی دیکھ شفیع کے ملنے والے کئی لوگ دُکان پر آئے۔ انھوں نے کچھ نہ کچھ خریداری کی۔شفیع کے سامان لینے کے لیے شہر جانے کے دوران وہ اکثر دُکان پر بیٹھ جاتی اور تھوڑی بہت دُکانداری کر لیتی تھی۔رُومانہ دوپہر بعد اسکول

سے لوٹ آتی۔ اس کے بعد دُکان کھول لیتی تھی۔ شام تک کچھ نہ کچھ سامان بک جاتا تھا۔ اسی طرح ایک ایک کر دن گزرتے گئے۔ نازیہ کی عدت بھی پوری ہوگئی۔

اچانک اُسے ناظمہ کا خیال آیا۔ وہ اُس کے بچپن کی سہیلی تھی۔ اُس کے شوہر کا بھی جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے دو بچے تھے۔ سسرال والوں نے پرواہ نہیں کی۔ جیسے تیسے عدت پوری ہوئی۔ ایک روز اس کے والدین آئے اور بیٹی ونواسوں کو اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ ماں باپ نے ہر طرح سے ان کا خیال رکھا۔ کسی چیز کی کمی نہیں آنے دی۔ وہ بیٹی کے نکاح کی کوشش میں تھے۔ اللہ کے حکم سے مناسب رشتہ مل گیا۔ نکاح ہوا اور وہ سسرال چلی گئی۔ نئی سسرال کے لوگ بہت اچھے تھے۔ انھوں نے نہ صرف بچوں کو قبول کیا، بلکہ اُن کی بہتر پرورش و تربیت بھی کی۔ سوتیلے باپ نے انگلش میڈیم اسکول میں بچوں کے داخلے کرائے۔ خزاں کے بادل چھٹ گئے۔ ناظمہ کی زندگی میں بہار آ گئی۔

عدت پوری ہونے کے کئی روز بعد بھائی آیا اور اُسے اپنے ساتھ لے گیا۔ اُس کے سامنے لمبی زندگی تھی، لیکن بھائی یا بھابی نے اُس کے نکاح کا ذکر تو دُور بچوں کی تعلیم یا اُس کی زندگی کیسے گزرے گی، کی بابت کوئی بات ہی نہیں کی۔ نازیہ کو بہنوں کے الفاظ یاد آ گئے اور دوسرے نکاح کے بعد بہار آنے کا خواب چکنا چور ہو گیا۔

نازیہ بچوں کو ساتھ لے کر گھر لوٹ آئی۔ رات کا کھانا کھایا اور بستر پر جا لیٹی۔ بچے بھی ماں کے پاس سو گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ کیسے زندگی کٹے گی؟ بچوں کی تعلیم کا کیا ہوگا؟ بہنوں نے تو دُکان پر بیٹھنے کو کہہ دیا، لیکن وہ کیسے دُکان چلائے گی؟ گھر کی عورتیں ضرورت کے تحت ہی کبھی کبھار باہر نکلتی تھیں۔ وہ دُکان پر کیسے بیٹھے گی؟

اگلے روز چائے پانی سے فراغت پا کر اُس نے برقع پہنا اور بچوں کے ساتھ دُکان پر پہنچ گئی۔ بہنوں کے مشورے کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اُسے سامان خریدنے اور فروخت کرنے کی کوئی جانکاری نہیں تھی۔ دُکان کے اندر عورت کو دیکھ کر جہاں دو تین مرد ٹھٹک کر رہ گئے، وہیں کئی عورتیں دُکان پر آئیں۔ نازیہ سے ہمدردی کی باتیں کیں، ضرورت سے متعلق کچھ سامان خریدا اور گھر کی راہ لی۔ رُومانہ نے سامان بیچنے میں ماں کی ہر ممکن مدد کی۔ ایک دو مرد بھی آئے اور بیڑی وسگریٹ خرید کر چلے گئے۔

رُومانہ کو کئی سامان کی قیمت معلوم نہیں تھی۔ وہ تیز قدموں سے سڑک پار تھوک کی دُکان پر گئی اور دُکاندار انکل سے ریٹ معلوم کر سامان فروخت کر دیا۔ مغرب کی اذان ہو گئی۔ نازیہ نے دُکان بند کی اور بچوں کے ساتھ گھر واپس آ گئی۔ اگلے روز بھی یہی عمل رہا۔ دُکان میں جو سامان ختم ہو جاتا، رُومانہ تھوک والے انکل سے لے لیتی۔

نازیہ کو دُکان پر جاتے ہوئے دو ہفتے ہو گئے۔ اب اُسے کچھ سامان کی خرید وفروخت کے بارے میں جانکاری ہو چلی تھی۔ نازیہ نے رُومانہ کو اسکول بھیج دیا اور دونوں بچوں کے ساتھ دُکان پر آتی رہی۔ دوپہر کو چھٹی کے بعد رُومانہ بھی ماں کا ہاتھ بٹانے دُکان پر پہنچ جاتی تھی۔

دُکان میں زیادہ سامان نہیں تھا۔اس لیے دُکان داری بھی زیادہ نہیں تھی۔سامان نہیں ہونے کی بنا پر کئی گراہک لوٹ جاتے تھے۔نازیہ تھوک کی دُکان سے اُدھار سامان لے سکتی تھی،لیکن اُسے یہ خوف تھا کہ اگر وقت پر دام ادا نہ ہو سکے تو کیا ہوگا؟ جیسے تیسے گاڑی کھنچ تو رہی تھی،لیکن وہ بات نہیں تھی، جو شفیع کے وقت میں ہوا کرتی تھی۔

ایک روز نازیہ بستر پر لیٹی تھی۔اس کی نگاہیں کمرے کی چھت پر مرکوز تھیں۔چھت میں ایک جگہ گہرا نشان سا تھا۔نشان سے چاروں طرف کوئی لائینیں نکل رہی تھیں۔ایسا لگ رہا تھا جیسے نشان ایک مرکز ہو اور اس سے نکلنے والی لائینیں راستے ہوں۔اس نے محسوس کیا کہ وہ چوراہے پر کھڑی ہے۔ ایک راستہ اُس کا جانا پہچانا ہے، جو کچھ دُور جانے کے بعد بند ہو گیا ہے۔ یہ راستے کے آخر میں بھائی کا گھر نظر آ رہا ہے۔دوسرا راستہ شہر کے چکا چوند بازار میں جا کر کھو جاتا ہے، جہاں عیش وعشرت کا سبھی سامان موجود ہے۔بچوں کے کھیلنے کے لیے الیکٹرانک کھلونے بھی ہیں،لیکن مٹھی خالی ہے۔دام نہیں،تو سب بیکار! ایک ٹیڑھا میڑھا راستہ ہے، جو جنگل کی طرف نکل جاتا ہے، جہاں ویرانی ہی ویرانی ہے۔ بیوہ کی سونی مانگ کی طرح۔ایک راستے میں کچھ فاصلے پر ایک بڑی جھیل ہے۔جس میں مرغابیاں اٹھکھیلیاں کر رہی ہیں۔ٹھیک اُسی طرح جس طرح وہ بچپن میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی،کودتی اور مستیاں کرتی تھی۔نہ کچھ کرنے کی فکر اور نہ کمانے کی پروا۔ ایک راستہ اسکول کی جانب نکلتا ہے، جہاں وقفے میں بچے کھیل کود کا مزہ لے رہے ہیں۔

نازیہ نے گہری سانس لی۔اُسے بچپن کا خیال آیا۔وہ بھی کیا دن تھے۔ محلے کے اسکول کی پڑھائی اور پھر کھیل کود۔وقت پر کھانا کھالینا، پانی پی لینا،شام ہوئی کچھ لکھ پڑھ لینا اور رات ہوئی تو چادر تان کر سو جانا۔موج ہی موج مستی ہی مستی۔کاش! کچھ اور پڑھ لیتی،تو آج سوچنا نہ پڑتا۔کسی نہ کسی دفتر میں نوکری کر رہی ہوتی۔گھر کا کام چل جاتا۔دُکان پر پورے دن میں بھی اتنی بکری نہیں ہوتی کہ بچوں کی بہتر پرورش ہو سکے۔

مرکز سے ایک چھوٹا سا راستہ اور نکلتا تھا، جو نزدیک ہی ایک کھلے میدان میں جا کر ختم ہو جاتا تھا۔اس میدان میں اکثر لڑکے پتنگ اُڑایا کرتے تھے۔آج بھی کئی لڑکے اپنے ہاتھوں میں پتنگ، چرخی، دھاگا اور مانجھے کے ساتھ وہاں پہنچے ہیں۔ ایک ایک کر سب نے اپنی اپنی پتنگ آسمان میں چڑھالی ہے۔دُور سامنے پیپل کا بے برگ درخت کھڑا ہے۔ کچھ دنوں پہلے اس پر سبز پتے تھے۔بعد میں وہ زرد ہونے لگے۔اور پھر خزاں کا موسم آ گیا۔ایک ایک کر تمام پتے زمین پر اُتر آئے۔ درخت پر سوکھی شاخیں رہ گئی۔ وہ ایک شاخ کو دیکھ ہی رہی تھی کہ اچانک ایک سرخ رنگ کی پتنگ اس شاخ میں اٹک گئی۔ پتنگ اُڑانے والے لڑکے نے کئی بار کوشش کی،لیکن پتنگ نکلنے کی بجائے اور الجھ گئی۔لڑکے نے آخری کوشش کے تحت ڈور کو زور سے جھٹکا دیا۔ ڈور ٹوٹ گئی اور پتنگ سے جڑی ڈور مزید شاخ میں الجھ کر رہ گئی۔اس کے بعد ہوا کے کئی جھونکے آئے،لیکن کوئی بھی جھونکا اسے نیچے لانے میں کامیاب نہیں ہوا۔

کئی روز گزر گئے۔ پتنگ اسی طرح شاخ میں اٹکی رہی۔ ہوا کے تیز جھونکے آتے، لیکن وہ ٹہنی سے جدا ہونے کی بجائے اور چپٹ جاتی۔ اگر پتنگ شاخ سے الگ ہو جاتی تو شاید اپنی منزل کی طرف گامزن ہو جاتی۔ کوئی لڑکا اُسے پکڑ لیتا یا دُور کہیں کھیت یا میدان میں گر جاتی اور کوئی خوشی خوشی اُسے اُٹھا لیتا۔ وہ بھی اس کے ساتھ خوش رہتی۔ ڈور کے سہارے اُوپر اُڑا کرتی۔ آسمان کی سیر کرتی اور پھر چرخی پر لپٹنے والی ڈور کے ساتھ اس کے ہاتھ میں آجایا کرتی۔

نازیہ کو محسوس ہوا کہ وہ بھی ایک پتنگ ہے۔ ڈور سے کٹی پتنگ۔ پیپل کی شاخ میں اٹکی پتنگ۔ کئی جگہ سے پھٹی پتنگ۔ ایسی پتنگ جو اَب قید ہے۔ درخت کی قید میں۔ شاخ کی قربت میں۔ اُس کی آزادی کا خواب شاید پورا نہ ہو۔ اُس کی سہیلی کی قسمت اچھی نکلی۔ بیوہ ہونے کے بعد اُسے ماں، باپ، بھائی و بہن کا پیار تو ملا ہی، شوہر، ساس اور خسر کی ڈھیر ساری محبت بھی حاصل ہے۔

ماں باپ کے انتقال کو برسوں گزر گئے۔ ایک بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ ان کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ شفیع کے سامنے ایسا نہیں تھا۔ بیوہ ہوتے ہی حالات بدل گئے ہیں۔ اب نہ کوئی اپنا رہا اور نہ کوئی مددگار۔ سبھی کے دروازوں پر قفل لگے ہیں۔ اپنوں کی امداد تو دُور، ہمدردی کے دو بول بھی ندارد ہیں۔ اَب وہ صرف ایک پتنگ ہے۔ شاخ میں اٹکی پتنگ۔ ایسی پتنگ جس میں اپنی ڈور توڑنے کی ہمت نہیں ہے۔ وہ نہ کسی منزل کی طرف جا سکتی ہے اور نہ ہی ہوا کے جھونکے سے پھٹ کر اپنا وجود کھو سکتی ہے۔

❑❑❑

تخلیق کاروں سے گذارش

اپنی تخلیقات/نگارشات صفحہ کے ایک طرف ہی لکھیں۔ ہر تخلیق پر غیر مطبوعہ کی تصدیق ہونا لازمی ہے۔

ای۔میل سے بھیجی ہوئی تخلیقات/نگارشات کی ہارڈ کاپی جس پر آپ کا پتہ اور موبائل نمبر صاف صاف درج ہو، بھیجنے کی زحمت کریں۔

جو تخلیقات کسی وجہ سے شائع نہیں ہوں گی، ان کی واپسی کے لئے اکادمی ذمہ دار نہیں ہوگی۔

تخلیقات کے ساتھ بینک اکاؤنٹ میں درج نام، بینک کا نام، شاخ کا نام، آئی۔ ایف۔ ایس۔ سی نمبر انگریزی میں لکھ کر بھیجنا ضروری ہے۔ پاس بک کی فوٹو کاپی یا کینسل چیک بھی منسلک کرنے کی زحمت کریں۔

اتر پردیش اردو اکادمی بچوں کے مزاج و معیار کے لحاظ سے

ماہنامہ **باغیچہ**

پورے آب و تاب کے ساتھ شائع کر رہی ہے۔ اس کے فروغ اور توسیع کے لئے آپ کا تعاون درکار ہے۔

۱۔ آپ اپنی تخلیقات بھیج کر

۲۔ خود خریدار بن کر اور دوسروں کو ترغیب دے کر

۳۔ بچوں میں اردو رسائل پڑھنے کا ذوق بیدار کر کے

اردو کی خدمت کر سکتے ہیں۔

اردو آئی اے ایس اسٹڈی سنٹر کے کلاس روم میں لکچر دیتے ہوئے فیکلٹی

طلبائے اسٹڈی سنٹر جدید کلاس روم میں ہمہ تن گوش

U.P. Urdu Akademi

Khabarnama

उ.प्र. उर्दू अकादमी ख़बरनामा

اُتر پردیش اُردو اکادمی خبرنامہ

Vol. No. 52 June 2024 Issue No. 12

اردو آئی اے ایس اسٹڈی سنٹر میں طلبا و طالبات کوچنگ حاصل کرتے ہوئے

اردو آئی اے ایس اسٹڈی سنٹر کے نوتعمیر ریڈنگ روم میں محو مطالعہ طلبا و طالبات